سوانح قاسمی ۱۳۷۳ھ

یعنی سیرت شمس الاسلام

سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس اللہ سرہ

جلد سوم ۳

مؤلفہ

رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی عم فیوضہم

حسب ہدایت

حضرت مولانا محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند

دفتر دار العلوم سے شائع کی گئی

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آخری سفر
اللہ کے گھر سے، اللہ کی طرف

آخری حج سے واپس ہوتے ہوئے مکہ اور جدّہ کے درمیان آپ پر مرض کا حملہ ہوا۔ گذر چکا کہ سفرِ حج سے واپسی کی یہی علالت، بالآخر آپ کی زندگی کی آخری علالت اور بیماری ثابت ہوئی۔ اسی اجمال کی تفصیل میری اس کتاب کا آخری باب ہے۔

سیدنا الامام الکبیر کی زندگی کے دوسرے واقعات و حالات جیسا کہ آپ دیکھ چکے، صرف گذرے ہوئے واقعات و حالات ہی نہیں ہیں، بلکہ آئندہ زندگی گذارنے والے چاہیں تو بصیرت و عبرت کے اسباق بھی ان کو اپنے لئے بنا سکتے ہیں۔ اسی حج کے قصہ کو دیکھئے، معاشی راہ میں آپ کی جد و جہد کا جو پیمانہ تھا، اسی پیمانے پر حاصل ہونے والی آمدنی سے روز کی روزی اور شدید و ناگزیر ضرورتوں کی فراہمی بھی عام حالات میں آسان نہیں ہے۔ لیکن مگر جو کچھ ہوا اس سے ہوا حیرت اس پر ہوتی ہے کہ اپنی اسی محدود عمر میں ایک چھوڑ تین تین حج کا زاد راحلہ حق سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے آپ کے لئے آسان کیا گیا۔ پہلے حج کا ذکر تو ۵ء والے فتنے کے ذیل میں

کر چکا ہوں۔ بتا چکا ہوں کہ دار و گیر کے ان ہی تاریک دنوں میں پنجاب اور سندھ کے آبی راستہ کو کشتیوں سے طے کر کے کراچی پہنچکر بادبانی جہاز پر سوار ہوئے، اور اللہ کے گھر اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانے تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ آپ کا یہ سفر ۱۸۶۰ء ماہ دسمبر یعنی ہجری کے حساب سے ۱۲۷۷ھ ماہ جمادی الثانی میں شروع ہوا تھا۔ اور دوسرے سال ۱۲۷۸ھ کے اسی جمادی الثانی کے مہینہ میں ہندوستان واپس ہوئے۔ حج کے اس سفر کے متعلق جو باتیں معلوم ہو سکیں، انہیں پیش کر چکا ہوں۔ آپ کی جہادی مہم کا تتمہ اس کو سمجھنا چاہیئے۔ اسی لئے ان کے ذکر کا موزوں مقام وہی سمجھا گیا، اسی طرح اس دنیا سے آخری سفر کا ذریعہ اور مقدمہ آپ کے آخری حج کا سفر چونکہ بن گیا مناسب معلوم ہوا کہ اس آخری حج کا تذکرہ بطور مقدمہ کے اسی باب میں کیا جائے۔ اول و آخر کے ان دونوں حجوں کے درمیان تیسرے حج کی جس نعمت سے آپ سرفراز ہوئے۔ یہ سفر کچھ اتنی خاموشی سے کیا گیا، کہ ذکر کرنے والے عموماً آپ کے دو ہی حجوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اچھے اچھے جاننے والوں سے پوچھا، جواب میں تیسرے حج کے علم سے انہوں نے ناواقفیت کا اقرار کیا۔ اسی لئے اس تیسرے حج کے سلسلہ میں جیسا کہ چاہیئے معلومات بھی حاصل نہ ہو سکیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اول و آخر کے ان دو مشہور حجوں کے سوا آپ نے تیسرا حج بھی کیا ہے، ہمارے مصنف امام نے درمیان کے اسی تیسرے حج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"۱۲۸۵ھ میں مولانا (نانوتوی) کو حج کی پھر سوجھی، چند رفقاء کو ساتھ لیکر حج کر آئے" ص ۳۹

ظاہر ہے کہ ۱۲۷۷ھ میں حج کا جو سفر کیا گیا، یا آخری حج جس کا ذکر اس باب میں کرنے والا ہوں، مصنف امام ہی نے اس کے متعلق لکھا ہے،

"شوال ۱۲۹۴ھ میں روانہ ہوئے" ص ۴۲

یقیناً اس کا مطلب یہی ہے کہ اول و آخر والے دونوں حجوں کے سوا درمیان میں ایک دفعہ

اور حجاز کا سفر آپ کیلئے آسان کیا گیا، لیکن آپ کا یہ حج زیادہ مشہور نہ ہوا، اور شاید اسی کا نتیجہ ہے، کہ مصنف امام جیسے بزرگ نے ذکر کرنے کی حد تک اس درمیانی حج کا ذکر تو کر دیا ہے، لیکن سن کے اندراج میں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شاید سہو ہوا جس کی وجہ یہ ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی مشہور کتاب "آب حیات" کے دیباچہ میں خود اپنے قلم سے اس کتاب کی تصنیف کے اسباب و وجوہ میں جو باتیں لکھی ہیں جن کا ذکر ابھی آ رہا ہے، آپ کی اس خود نوشتہ تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا یہ سفر ۱۲۸۶ھ میں شروع ہوا تھا۔ مصنف امام کے قلم سے بجائے (۸۶) کے (۸۵) کا ہندسہ درج ہو گیا ہے۔ اب اسے زلت قلم سمجھا جائے، یا شاید تخمینہ میں کچھ چوک ہوئی ہو، اس سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے، کہ مصنف امام بھی اس حج کے حال سے پورے طور پر آگاہ نہ تھے۔ اس زمانہ میں جیسا کہ اسی کتاب میں لکھا ہے، بہ سلسلۂ ملازمت (ڈپٹی انسپکٹری) بریلی لکھنؤ وغیرہ مختلف شہروں میں مصنف امام کا قیام رہتا تھا۔

بہر حال خود حضرت والا کی تحریری شہادت سے جو تاریخ معلوم ہوتی ہے یعنی ۱۲۸۶ھ ہجری عیسوی حساب سے یہ ۱۸۷۰ء کا سال تھا، اور پہلا حج ۱۸۶۰ء میں ہوا تھا، گویا اسی کے دس سال بعد دوسرے حج کیلئے آپ ہندوستان سے روانہ ہوئے، واپسی کب ہوئی، نہ اس کا ذکر ہی کسی نے کیا، اور نہ کسی ذریعہ سے صحیح علم اس کا ہو سکا، مصنف امام نے صرف اسی قدر لکھا ہے۔

"چند رفقاء کو ساتھ لے کر حج کر آئے"

کب واپس ہوئے، نہ اسی کا پتہ آپ کے اس اجمالی بیان سے چلتا ہے، اور نہ یہی معلوم ہوا کہ ان رفقاء میں کون کون سے حضرات کو ہمرکابی کی سعادت میسر آئی تھی۔ البتہ آگے انہوں نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"منشی ممتاز علی صاحب بھی اسی سال بقصد قیام عرب کو گئے، مگر ایک سال بعد واپس آ گئے" ص ۳۹

یہ منشی ممتاز علی وہی صاحب ہیں، جن کا ذکر مختلف موقعوں پر گذر چکا ہے، یعنی خطی لقب جن کا

"نزہت رقم" تھا۔ ہندوستانی مطابع میں خط نسخ (عربی) کی کتابت کرنے والوں کا بتا چکا ہوں
کہ زیادہ تر ان ہی منشی ممتاز علی اور ان کے بیٹوں منشی مشتاق علی و عبدالغنی مرحومین پر سلسلۂ تلمذ
منتہی ہوتا ہے۔

دلی کا مشہور مطبع مجتبائی، اس کے بانی یہی منشی ممتاز علی مرحوم تھے، ان ہی سے مولوی
سید الاحد نے اس مطبع کو خریدا، اور اسی کی بدولت دلی کے رؤسائے اعظم میں گنے گئے مصنف
امام ہی کے حوالہ سے کہیں نقل کر چکا ہوں کہ منشی ممتاز علی اور سیدنا الامام الکبیر کے درمیان
"پرانی دوستی" تھی۔ میرٹھ میں منشی صاحب ہی نے آپ کو بلا کر رکھ لیا تھا۔ قرینہ کا اقتضاء ہے
کہ منجملہ دوسرے رفیقوں کے منشی جی بھی حج کے اس دوسرے سفر میں آپ کے رفیق ہی نہ تھے
بلکہ تعجب نہیں کہ زاد و راحلہ کی پیش کش بھی ان ہی کی طرف سے ہوئی ہو، چونکہ اس وقت تک
یعنی ۱۲۹۷ھ تک دخانی جہاز سے حج کا سفر شروع ہو گیا تھا۔ اس لئے قیاس یہی سمجھنا چاہئیے کہ
پانچ چھ مہینہ سے زیادہ آمد و رفت میں صرف نہ ہوا ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب

چاہئیے تو یہی تھا کہ مصنف امام جیسے بزرگوں نے اس دوسرے حج کے ذکر میں جب حد
سے زیادہ اجمال سے کام لیا تو ہم بھی اس سے زیادہ اس کے متعلق اور کچھ نہ لکھتے لیکن خوش
قسمتی سے سیدنا الامام الکبیر ہی کی کتاب "آب حیات" کے دیباچہ میں بعض دل چسپ اور دل آویز
باتیں اسی دوسرے حج کے متعلق پائی جاتی ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ آخری حج کے
تذکرہ کے ساتھ "آب حیات" کی ان باتوں کا بقدر ضرورت یہاں ذکر کر دیا جائے۔

آپ کی یہ کتاب "آب حیات" جو شاید حضرت والا کی تمام تصنیفات میں سب سے زیادہ مشکل
کتاب ہے، اس میں بقول آپ کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنوز قبر میں زندہ ہیں اور مثل گوشہ نشینوں اور چلہ
کشوں کے عزلت گزین ہیں۔

کتاب و سنت کے بینات کو عقلی استدلال کے رنگ میں پیش کرنے کی یہ ایک ایسی کوشش ہے کہ

آدھی کتاب کو پڑھ ڈالا جاتا ہے، اور ایسے نتائج ان ہی بیانات سے نکالے ہوئے اس کے سامنے آنے جاتے ہیں، جن کی طرف خیال بھی نہیں گذرتا تھا کہ ان ہی سے وہ پیدا ہو سکتے ہیں۔ کتاب کے مضامین کی قدر و قیمت مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتی ہے، اگرچہ اس کے مطالعہ کے لئے کمال استعداد کے ساتھ کافی صبر و استقامت کی ضرورت ہے۔ اس وقت صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ درحقیقت سیدنا الامام الکبیر کی ایک قدیم تصنیف "ہدیۃ الشیعہ" جو رفض کی تردید میں لکھی گئی ہے۔ اسی کتاب ہدیۃ الشیعہ کا "آب حیات" دراصل تتمہ یا تکملہ ہے۔ باغ فدک وغیرہ کی وراثت کے قصوں میں یہ یہ سوال جو پیدا ہوتا ہے، کہ وارثوں میں ترکہ کی تقسیم کا مسئلہ تو مورث کی وفات اور موت کے بعد پیدا ہوتا ہے، لیکن مورث کی زندگی میں وراثت کی فکر میں الجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے، اسی سلسلہ میں اہل سنت والجماعت کا جو یہ عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بجسدہ اپنے روضہ پاک میں زندہ ہیں، اسی کو بنیاد بنا کر سیدنا الامام الکبیر نے گویا سمجھنا چاہئے، کہ حیات و موت اور اس کے ظہور کی مختلف شکلوں کے متعلق ایک مستقل نظام ہی کو مرتب کر کے پیش کیا ہے۔

آب حیات کے دیباچہ میں ان ہی باتوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے لکھا ہے، کہ

"۱۲۸۶ھ ہجری میں قبل رمضان شریف سراپا کرم و عنایات مہتمم مطبع ضیائی واقع میرٹھ منشی محمد حیات نے تحریر مذکور مسمی بہ ہدیۃ الشیعہ کو چھاپنے کا ارادہ کیا اور اس کی تصحیح میرے ذمہ ڈالی۔" ص۳

اس کے بعد آپ نے ارقام فرمایا ہے کہ تصحیح کے موقع پر خیال آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بجسدہ زندگی کا جو دعویٰ ہدیۃ الشیعہ میں کیا گیا تھا، استدلالی طور پر جیسی کہ چاہئے اس پر بحث نہ ہو سکی تھی پس مناسب معلوم ہوا کہ

"اول اس دعوے کو موجہ کیا جائے۔ دوسرے اعتراض تعارض آیت کریمہ انک میت اور علی ہذا القیاس اعتراض تعارض بعض احادیث کا جواب دیا جائے۔"

اسی خیال کے پیش نظر ہدیۃ الشیعہ کے اس مقام کی تفصیل میں آپ مشغول ہوئے، اسی عرصہ میں رمضان شریف کا مہینہ آگیا، جس میں کام پورا نہ ہو سکا۔ اسی کے ساتھ کچھ اور موانع اور رکاوٹوں وغیرہ کا ذکر کر کے آخر میں اطلاع دیتے ہیں کہ

"ہنوز اس تقریر کے اتمام کی نوبت نہ آئی تھی کہ سامان غیبی باعثِ عزمِ سفرِ حج ہوا، آٹھویں شوال کو وطن سے رخصت ہو کر گرد افشائے راہ بیت اللہ اختیار کی۔" ص۳

اور یہی میں عرض کرنا چاہتا تھا، کہ دوسرے حج کا یہ سفر ۱۲۸۶ھ ماہ شوال میں شروع ہوا آپ کی خود نوشتہ تحریری شہادت سے یہی ثابت ہوتا ہے۔[۱]

حج کے اس سفر کی وجہ سے چاہئے تو یہی تھا کہ ہدیۃ الشیعہ کی تصحیح و نظر ثانی کا جو کام شروع ہوا تھا، وہ ملتوی ہو جاتا لیکن آپ ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی محمد حیات نے اصرار کیا کہ سفر میں بھی جہاں جہاں موقع ملے، اس کام کو جاری رکھا جائے۔ کیونکہ ہدیۃ الشیعہ کے بعض تصحیح شدہ اجزا چھپ بھی چکے تھے، حضرت والا نے بھی التوا کو مناسب خیال نہ کیا، اور مسودہ کو ساتھ لے کر بمبئی پہنچے۔ عام طور پر جیسا کہ اب بھی ہوتا ہے، یعنی جہاز کے انتظار میں حاجیوں کو عموماً کچھ دن بمبئی میں ٹھیرنا پڑتا ہے، یہی صورت آپ کے ساتھ بھی پیش آئی۔ لکھا ہے کہ

"بمبئی پہنچا تو ہر چند دس بیس روز تک وہاں رہنا پڑا، مگر کچھ دن بوجہ کاہلی امروز و فردا میں گذرے، اور کچھ دن بیماری کے بہانہ میں رائگاں گئے، آخر ایام قیام میں طبیعت پر بوجھ ڈال کر بیٹھا، اور جوں توں بن پڑا، پانچ یا چار دن میں تمام کیا۔" ص۳

---

[۱] مصنف امام کے الفاظ یعنی "۱۲۸۵ھ میں مولانا کو حج کی سوجھی" اس فقرے میں "سوجھی" کے لفظ کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ حج کا خیال پیدا ہوا اور دوسرے سال ۱۲۸۶ھ میں غیب سے اس سفر کا سامان مہیا ہو گیا، تو گویا تطبیق کی ایک شکل نکل آتی ہے ۱۲

جس سے دوسرے سفرِ حج کے موقعہ پر بمبئی کے قیام کی مدت کا بھی پتہ چلتا ہے، اور اس کا بھی کہ بمبئی پہنچنے کے بعد طبیعت بھی حضرت کی کچھ ناساز ہوگئی تھی۔ لیکن باایں ہمہ سفر کے اسی حال میں آپ نے ہدیۃ الشیعہ کے اس ضمیمہ کو جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بجسدہ زندہ رہنے کو ثابت کیا گیا تھا، پورا کیا۔ چاہیئے تو یہی تھا کہ بمبئی ہی سے اس کو میرٹھ منشی محمد حیات کے پاس بھیجدیتے۔ لیکن ایسا نہ ہوا کیوں نہ ہوا؟ اسی کا جواب دیتے ہوئے جو کچھ ارقام فرمایا گیا ہے کان والوں کو چاہیئے کہ اس کو سنیں، اور جو آنکھیں رکھتے ہیں، ان ہی کو میں دکھانا چاہتا ہوں۔

مکہ معظمہ میں جیسا کہ معلوم ہے حضرت والا کے پیر و مرشد حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان سے ہجرت کر کے مقیم ہو چکے تھے، اور خود کیا مقیم ہوئے تھے۔ اسی دیباچہ میں سیدنا الامام الکبیر نے براہ راست اپنی یہ شہادت قلم بند کی ہے، یعنی حاجی صاحب قبلہ کا ذکر کر کے لکھا ہے، کہ

"ہنگامہ رستخیز، غدر ہندوستان کے بعد وطن قدیمی تھانہ بھون ضلع سہارنپور و مظفر نگر کو چھوڑ کر بحکم اشارات باطنی بلد اللہ الامین مکہ معظمہ زادہا اللہ شرفاً و عزۃً میں مقیم ہیں" ص[1]

آپ دیکھ رہے ہیں۔ حضرت والا کے ذمہ دار قلم سے "بحکم اشارات باطنی" کے الفاظ جو اس موقعہ پر درج ہوئے ہیں، یقیناً یہ صرف الفاظ نہیں ہیں۔

بہر حال اس وقت تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہدیۃ الشیعہ کا یہ ضمیمہ اگرچہ بمبئی ہی میں لکھا جا چکا تھا،

---

[1] آپ کی اس عبارت میں ۵۷ء کے فتنہ کی تعبیر "غدر" کے لفظ سے کی گئی ہے۔ ممکن ہے عام شہرت کی وجہ سے یہی لفظ قلم پر آ گیا ہو۔ علاوہ اس کے ۵۷ء میں غدر یعنی عہد شکنی تو ہوئی تھی۔ لیکن ابتداءِ عہد شکنی کی حکومت کی طرف سے ہوئی تھی، یا رعایا کی طرف سے؟ اس کی تفصیل اپنے مقام پر آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس لئے غدر کے لفظ پر لوگوں کو متعجب ہونا چاہیئے۔ دوسرا لطیفہ تھانہ بھون کے ضلع کے مستقر کے متعلق سہارنپور اور مظفر نگر دونوں ہی کے نام درج کر دیئے گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تھانہ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے دونوں ہی شہروں سے تعلق رکھتا ہے اور دونوں ہی کی طرف منسوب ہو سکتا ہے ۱۲

اور ابتداء میں چاہا گیا تھا کہ

"بعد اتمام اصل (ترجمہ) کو میرٹھ روانہ کیجئے اور نقل بغرض پیش کش حضرت پیر و مرشد دام اللہ فیوضہ ساتھ لیجئے"

لیکن ظاہر ہے کہ سفر کی بے اطمینانیوں کے زمانہ میں اصل ہی کا لکھنا آسان نہ تھا، چہ جائیکہ اصل کے ساتھ اس کی نقل بھی لکھی جائے۔ ارقام فرمایا گیا ہے۔

"نقل کا اتفاق نہ ہوا، زمانہ روانگی کا جلد آ گیا۔ ناچار ہو کر میرٹھ کا بھیجنا موقوف رکھا"

گوش حقیقت نیوش کے لئے جس چیز کو پیش کرنا چاہتا ہوں، اسے اب سنئے، حضرت حاجی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور بھی ہے، اور تفصیلاً اسی کتاب میں لکھ بھی چکا ہوں کہ معمولی فارسی اور عربی میں صرف و نحو کے ابتدائی رسالوں تک آپ کی ظاہری تعلیم محدود تھی، لیکن صرف پیش کش کرنے کے لئے نہیں، بلکہ سیدنا الامام الکبیر کی تمام کتابوں میں سب سے زیادہ ادق اور حد سے زیادہ عمیق لطائف و حقائق پر جو کتاب مشتمل ہے، جانتے ہیں، حاجی صاحب کی خدمت میں اس کو کس لئے پیش کرنے کے لئے، لئے جا رہے تھے۔ ان ہی سے سنئے، پہلا فقرہ تو اس سلسلہ کا یہ ہے، کہ

"با امید ہائے چند در چند، ایک بار حضرت پیر و مرشد دام اللہ فیوضہ کے گوش گذار کر دینا، یا ملاحظہ اقدس سے گذار دینا ضروری سمجھا"

ان ہی چند در چند امیدوں میں اپنی بعض امیدوں کا ذکر آپ نے خود ہی اس موقعہ پر فرمایا ہے جب کتاب حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو سنا دی گئی لکھتے ہیں کہ

"اس ہدیۂ مختصرہ کو قبول فرما کر صلہ و انعام میں دعائیں دیں"

شاید یہ پہلی امید تھی، جو پوری ہوئی، لیکن اس پر نہیں، حیرت جس پر ہوتی ہے، وہ آگے کے فقرات ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"علاوہ بریں تصحیح وجدانی اور تحسین زبانی سے اس ہیچ مدان کی اطمینان فرمائی۔"

صرف یہی نہیں، سنئے اسی کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ

"اپنی کم مائگی' اور ہیچ مدانی کے سبب جو تحریر مذکور' کی صحت میں تردد تھا' رفع ہوگیا۔"

اور یہ ہے ' نایافتگی کا وہ کمال جس کے بعد "یافت" کا دروازہ کھل جاتا ہے' اسی موقعہ پر سیدنا الامام الکبیر نے اس مشہور بات کا خود اقرار بھی فرمایا ہے' لکھا ہے کہ

"پھر کوئی یہ سمجھے ' اور متعجب ہو' کہ قاسم نادان کی تحقیق اور تنقیح اور ایسی تحسن و صحیح - ع

زبان گنگ وچنین نغمہ خوش آئندہ

میں کہاں اور یہ مضامین عالی کہاں ' بسبب اسی شمس العارفین (حاجی صاحب قبلہ) کی نورافشانی ہے' یہاں بھی مثل زبان ودست وقلم' واسطہ ظہور مضامین مکنونہ دل عرش منزل ہوں۔"

اسلام اور سارے اسلامی علوم ہی کی بنیاد ہی "اُمیّت" پر اگر قائم نہ ہوتی' اور علم کی غیر معمولی راہ کی اطلاع "اتیناہ من لدنا علما" کی قرآنی آیت میں اگر نہ دی جاتی' تو جس واقعہ کا اعتراف فرمایا گیا ہے' شاید اس کا باور کرنا بھی آسان نہ ہوتا' آخر اسی دنیا میں تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ دوسروں کے افکار ونظریات کو اپنی طرف منسوب کر لینے کا عام رواج ہے' لیکن علمی سرقات وانتحالات کی اسی دنیا کا ایک معکوس تماشا وہ بھی ہے' جو اس اعترافی آئینہ میں دکھایا گیا ہے - خیر یہ تو ایک ضمنی بحث تھی' ذکر آپ کے اس درمیانی حج کا ہو رہا تھا - اسی کتاب کے دیباچہ میں ہے' میرٹھ بھیجنے کا ارادہ مسودہ کے متعلق جو تھا' اس کو ملتوی کر کے فرماتے ہیں کہ

"اوراقِ مسودہ کا پشتارہ باندھ کر جہاز پر چڑھا"

جہاز پر کن احساسات کے ساتھ سوار ہوئے، اور جدہ پہنچے، پڑھئے اور سر دھنئے، ارقام فرمایا گیا ہے

"اور محض بامداد خداوندی، باوجود گمراہی، اور نا مہ سیاہی کے جس کی وجہ سے اپنی رسائی تو درکنار ہمراہیوں کی گم گشتگی کا بھی اندیشہ تھا، دریا پار ہوکر جدہ پہنچا" ص۱۱

یہ ہے، عبدیت اور بندگی کی وہ شان، کہ سب کچھ مل رہا ہے، لیکن بندے کی نظر اپنی بندگی سے ایک لمحہ کیلئے نہیں ہٹتی، جدہ پہنچنے کے بعد آگے بیت اللہ الحرام کی طرف روانگی کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ ارقام فرمایا گیا ہے، وہ بھی سننے کے قابل ہے، ارشاد ہوا ہے۔

"اور وہاں سے (یعنی بندرگاہ جدہ سے) بسواری شتر دو روز میں دونوں قبلوں[1] کی زیارت سے مشرف ہوا"

حالانکہ مکہ معظمہ میں ایک ہی قبلہ ہے، لیکن بجائے اس ایک قبلہ کے آپ دیکھ رہے ہیں۔ حلقہ دیوبند کے سیدنا الامام الکبیر فرماتے ہیں

"دو قبلوں کی زیارت سے مشرف ہوا"

پہلے قبلہ کی تشریح ان الفاظ میں فرمانے کے بعد یعنی

"بیت اللہ زادھا اللہ شرفاً وعزۃ الی یوم القیمۃ کا طواف میسر آیا"

اسی مکہ معظمہ بلد اللہ الامین میں اپنے دوسرے قبلہ[1] کی نشاندہی جن الفاظ میں فرمائی گئی ہے

---

[1] مسلمانوں میں "قبلہ و کعبہ" کے الفاظ یوں تو بزرگوں والدین وغیرہ کے متعلق عام طور پر مستعمل ہیں۔ بظاہر علماء کی طرف سے جہاں تک میں جانتا ہوں اس پر داروگیر عموماً نہیں کی گئی۔ یوں بھی جس کی طرف رخ کیا جائے حقیقتاً اس کو قبلہ کہتے ہیں۔ پھر حق سبحانہ و تعالیٰ کو اپنا مطلوب و مقصود بنا کر عموماً شیخ طریقت کی طرف رخ کیا جاتا ہے، جیسے کعبہ کی طرف بھی رخ حق تعالیٰ ہی کی عبادت کے لئے آدمی کرتا ہے۔ وجہ تشبیہ ظاہر ہے، نیز صحاح کی اس حدیث کی رو سے جس میں ہے کہ کعبہ کی طرف ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (باقی اگلے صفحہ پر)

میں ان کو نقل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن حیران ہوں کہ ان مسکینوں، دین اور عقل کے مسکینوں کی شکم پروری کا ذریعہ کیا باقی رہے گا۔ جو کوچہ و بازار میں اکابر دیو بند پر توہب کی تہمت تراشیوں سے ناواقف مسلمانوں کی جیبیں تراش رہے ہیں۔

اور بیداری کا پیغام ان چھوٹوں کے لئے بھی ہے، جن کے چھوٹے حوصلوں، اور تنگ سینوں میں اپنے بڑوں کے احترام و عقیدت کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے، وہی جو کچھ نہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو سب کچھ باور کئے بیٹھے ہیں، لیکن دیکھئے اس پوری کتاب میں جس کی بڑائیوں کا نظارہ مسلسل آپ کے سامنے گذرتا رہا ہے، اپنے بڑوں کے آگے وہ کتنا چھوٹا بن جاتا تھا، سنئے، دوسرا قبلہ جس کی زیارت سے شرف اندوز ہونے کا موقعہ مکہ معظمہ پہنچکر میسر آیا، ان ہی کے الفاظ میں سنئے، فرماتے ہیں۔

"اعنی بزیارت مطلع انوار سبحانی، منبع اسرار صمدانی، مورد افضال ذی الجلال و الاکرام، مخدوم و مطاع خاص و عام، سرحلقہ مخلصان، سراپا اخلاص، سرلشکر صدیقان باختصاص، رونق شریعت، زیب طریقت، ذریعہ نجات، وسیلہ سعادات، دستاویز مغفرت نیاز مندان، بہانہ واگذاشت مستمندان، ہادی گمراہان، مقتدائے دین پناہان، زبدۂ زمان، عمدۂ دوران سیدنا و مرشدنا

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) اشارہ کر کے فرمایا کہ خدا کے نزدیک تو سب سے زیادہ محترم ہے۔ لیکن ایک مومن کا احترام تجھ سے بھی زیادہ ہے۔ اس حدیث کی بنیاد پر بھی سیدنا الامام الکبیر کی تعبیر میں خلجان کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی کرامات امدادیہ میں حضرت تھانوی نے نقل کیا ہے کہ مکہ معظمہ کے شریف کا کوئی مصاحب تھا جو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے دل میں کچھ کدورت رکھتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ نامی کر کے نقصان نہ پہنچائے۔ ایک دن وہی حاجی صاحب کی مجلس مبارک میں حاضر ہوا تو اس سے کہنے لگے، کہ خالق کے سوا کسی مخلوق سے میں نہیں ڈرتا، اور فرمایا کہ "زیادہ سے زیادہ مکہ معظمہ سے مجھے کوئی جلاوطن کرا سکتا ہے، مگر یاد رکھو کہ جہاں بیٹھ جاؤں گا میرا تو وہی مکہ اور وہی مدینہ ہے۔" اس کے بعد کعبہ کی حقیقت بیان کر کے یہ بھی ارشاد ہوا کہ البتہ جو لوگ جامع ہیں وہ حقیقت کے ساتھ صورت کی بھی رعایت کرتے ہیں اور ظاہری مکہ و مدینہ کو بھی نہیں چھوڑتے۔" صفحہ ۲، حضرت تھانوی نے اسی کے ذیل میں لکھا ہے کہ کوئی شخص مکہ و مدینہ میں رہے لیکن اصلاح باطن نہ کرے تو اس کا وہاں رہنا ہیچ ہے ۱۲

مولٰنا الحاج امداد اللہ لازال کاسمہ امداد اًمن اللہ المسلمین واہل اللہ "

دیکھا آپ نے ؟ دوسرا قبلہ مکہ معظمہ میں آپ کا کون تھا، اپنے بزرگوں کے احترام وعقیدت کا اس سے زیادہ بہتر نمونہ اور کیا پیش کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو "ہدیۃ الشیعہ" کا وہ ضمیمہ سنایا گیا، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بجسدہ زندہ رہنے کے دعوے کو مدلل کیا گیا تھا، یہ ارقام فرمانے کے بعد

"جب زبان فیض ترجمان (حاجی صاحب) سے آفرین وتحسین سن لی، تو اصل مضامین کی حقیقت تو اپنے نزدیک محقق ہوگئی" ۔ ص۵

آگے حضرت حاجی صاحب کے اس حکم اور مشورہ کو نقل کیا گیا ہے کہ

"تقریر اثبات حیات، سید الموجودات، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیۃ الشیعہ سے جدا کر کے جدا نام رکھ دیجئے"

اسی حکم کی تعمیل میں ارادہ کیا گیا کہ مستقل کتاب کی شکل میں اس خاص مسئلہ کے مباحث کو مرتب کر دیا جائے، اور حج کے اسی سفر میں جیسا کہ ارقام فرمایا گیا ہے کہ

"دل میں یہ ٹھان کر قلم اٹھایا، اور ٹھہرائی کہ شروع تو خدا کے گھر سے کیجئے اور بن پڑے تو بوسہ گاہ عالم، در سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر اختتام کو پہنچا دیجئے۔ تاکہ ابتداء اور انتہا دونوں مبارک ہوں، ورنہ جس قدر بن پڑے غنیمت ہے کیونکہ اس وسیلہ سے اس ظلوم وجہول کو امید صحت اور ظنِ حسنِ قبول ہے" ۔ ص۶

متوسط تقطیع پر حضرت والا کی یہ کتاب "آب حیات" (۲۵۸) صفحات پر ختم ہوئی ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ کتاب کی ابتداء اور انتہا کے متعلق یہ ارادہ جو طے کیا گیا تھا، کام اسی ارادہ کے مطابق پورا ہوا یا نہیں، امید تو یہی ہے کہ "خدا کے گھر" میں جو نیت کی گئی تھی، خدا نے اس نیت کو پورا ہی کیا ہوگا، آخری فقرے جس پر کتاب کا یہ دیباچہ ختم ہوا ہے وہ یہ ہیں

"سو تا دم تحریر سطور تو یہ کمترین انام آستانہ خداوندی پر جبہ سا ہے، اور پرسوں پچیسویں ذی الحجہ سنا ہے کہ مشتاقان زیارت کا مدینہ منورہ کو ارادہ ہے، ان کے ہم رکاب، انشاء اللہ تعالیٰ یہ ننگ امت بھی روانہ ہونے والا ہے۔" صلے

آپ کے دو مشہور حج کے درمیان اس تیسرے حج کے متعلق مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے، کہ حج کے مناسک سے فارغ ہونے کے بعد ۲۲ ۔ ذی الحجہ تک مکہ معظمہ ہی میں قیام رہا ۔ اور جو اطلاع دی گئی ہے، اسی کے مطابق اگر مدینہ کا قافلہ ۲۵۔ ذی الحجہ کو مکہ معظمہ سے روانہ ہوا، تو مدینہ منورہ جانے کی تاریخ بھی گویا متعین ہو جاتی ہے، اور آب حیات کے دیباچہ کی اسی عبارت سے یہ نتیجہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ حضرت والا کی تصنیفات میں ایک کتاب ایسی بھی ہے جو حرمین میں لکھی گئی، یا کم از کم اس کتاب کا کچھ حصہ ایمان و دین کے ان ہی دونوں مرکزوں میں قلم بند ہوا۔ "قبہ خضراء" کے سامنے بیٹھ کر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی گوشہ نشینی، اور عزلت گزینی کی استدلالی تصویر کشی کی ۔ وجدانی حلاوتوں اور کشفی لذتوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے اور کیسے کہا جائے کہ جو کچھ دیکھا جا رہا تھا، نہ دیکھنے والوں کو مانوس بنانے کیلئے دلائل و براہین کے لباس میں اسی کو جلوہ گر کیا جا رہا تھا، لیکن جو خود (راقم الحروف) نابینا ہو، دوسرے نابیناؤں کو کیا بتائے ۔

کچھ بھی ہو، ذاتی طور پر اپنے حج کے اس سفر میں جن نعمتوں سے سرفرازیاں ہوئیں، ان کے سوا اس میں شک نہیں کہ "آب حیات" کی شکل میں دوسروں کے لئے بھی ایک ایسا عرفانی و علمی ہدیہ آپ ہندوستان لائے، جس سے خدا ہی جانتا ہے کہ نفع اٹھانے والے کب تک نفع اٹھاتے رہیں گے، علاوہ اس خاص مسئلہ کے جو اس رسالہ کا خاص موضوع ہے ذیلی طور پر بے شمار نکات و اسرار سے پردہ اٹھایا گیا ہے خصوصاً اس پر بحث کرتے ہوئے کہ امہات المؤمنین ازواج مطہرات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عقد کی اجازت

اسی بنا پر نہیں دی گئی کہ جس قسم کی موت سے عقد نکاح ختم ہو جاتا ہے، اس قسم کی موت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر طاری ہی نہیں ہوئی تھی۔ اسی سلسلہ میں "تعدد ازواج" کا مسئلہ بھی آپ کے سامنے آگیا ہے۔ عام مسلمانوں کو چار بیویوں کی حد تک اجازت اسلام میں کیوں محدود کر دی گئی، اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو تحدید کے اس قانون سے کیوں مستثنیٰ رکھا گیا، یا بجائے بیویوں کے ماملکت ایمانکم یعنی شرعی لونڈیوں کے متعلق عام مسلمانوں پر تحدید کا یہی قانون کیوں نہ عائد کیا گیا۔ پڑھنے والے اس کتاب کو اگر غور سے پڑھیں گے، تو وہ بھی اسی فیصلہ پر پہنچیں گے، کہ بحث کرنے والوں نے خصوصاً اس زمانہ میں حالانکہ ان مسائل پر بہت کچھ لکھا ہے، لیکن اسلام کے ان ہی ضوابط کی جو دل آویز، دل نشین توجیہیں حرمین کے اس ہدیہ علمیہ یعنی "آب حیات" میں پائی جاتی ہیں، شاید روح القدس کی لاہوتی تائید کے بغیر ذہن کا ان کی طرف منتقل ہونا آسان نہ تھا۔

تفصیلاً نہ سہی، لیکن اجمالاً آپ کے اس درمیانی سفر حج کے متعلق جو "معلومات" "آب حیات" کے دیباچہ کی مدد سے مہیا ہوگئیں وہی غنیمت ہیں، ان کا درج کرنا اس لئے بھی مناسب معلوم ہوا کہ حافظوں میں آپ کے اس حج کی یاد باقی نہ رہی تھی۔ حالانکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ بجائے خود آپ کا یہ حج بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔

اب آئیے! سیدنا الامام الکبیر کے اس "آخری حج" کی داستان سنئے، جو اللہ کے گھر کا آخری سفر تھا، اور اللہ کے گھر کا یہی سفر اللہ کی طرف سفر کا مقدمہ اور ذریعہ بن گیا۔

آخری و وداعی حج

سیدنا الامام الکبیر کے پہلے حج اور دوسرے حج میں یاد ہوگا، حساب کرکے بتایا گیا تھا، کہ تقریباً دس سال کا فاصلہ تھا، اور زندگی مبارک و مسعود کا یہ آخری حج جس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عاشق الٰہی مرحوم نے اپنی کتاب تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے، کہ اسی حج سے واپس ہوتے ہوئے راستہ میں

"مولانا محمد قاسم صاحب کو علالت لاحق ہوئی"۔

اور ان ہی کے الفاظ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ

"آہستہ آہستہ بڑھ کر آخر وہی بیماری مرض الموت بنی" ص۲۲۴ ج ۱

گویا اسی واقعہ نے حضرت والا کے اس حج کو وداعی حج بنا دیا۔ اللہ اللہ جس میں کھو کھو کر پانے والا سب کچھ پاتا چلا جا رہا تھا، سرفرازیوں کی اس کی کوئی حد ہے۔ کام تو کام اپنے آقا کے کام کے نام تک سے حصہ پانے کیلئے ان قدرتی حیلوں یا الٰہی تیسرات کو آپ دیکھ رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کے اس "آخری وداعی حج" اور جو صورت اس میں پیش آئی، اس کو سوچتے ہوئے "حجۃ الوداع" کے تاریخی لفظ کی طرف ذہن منتقل ہو جائے، تو اس پر متعجب نہ ہونا چاہئے۔

پہلے بھی بار بار کہہ چکا ہوں کہ "فاتبعونی" کی صلائے عام پر لبیک کہنے والوں کے انعام اور صلوں کا اندازہ وہ نہیں کر سکتے، جو کرنے کے لئے نہیں بلکہ سننے، اور صرف سننے ہی کے لئے سنتے ہیں۔ خیر کہنا یہ ہے، مصنف امام نے اس آخری وداعی حج کے متعلق جو یہ خبر دی ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر

"شوال ۱۲۹۴ھ میں روانہ ہوئے، اور ربیع الاول ۱۲۹۵ھ کے اول پھر اپنے وطن واپس آئے"

جس کا مطلب عیسوی سن کے حساب سے یہ ہوا کہ ۱۸۷۷ء اوائل ماہ اکتوبر یا اواخر ستمبر کی کسی تاریخ میں روانہ ہوئے، اور ۱۸۷۸ء ماہ فروری کی کسی تاریخ میں ہندوستان واپس لوٹے۔

اس سے پہلے درمیانی جیسا کہ گذر چکا آپ نے ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں کیا تھا، گویا ابھی پورے آٹھ سال بھی نہیں گذرے تھے کہ اچانک تیسرے حج کے سفر کے لئے قدرتی آسانیاں غیب سے مہیا ہو گئیں۔ اور اس طور پر مہیا ہوئیں، کہ پہلے سے اس سال کے حج کا شاید خطرہ بھی قلب مبارک پر نہ گذرا تھا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جانے والے جیسے ارادہ کر کے جاتے ہیں۔ اسی طرح پہلے دونوں حج کے لئے تو آپ نے خود جانے کا ارادہ کیا، اور پہنچانیوالا

منزل مقصود تک پہنچاتا رہا۔ لیکن اس تیسرے حج کے متعلق چاہا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ

ع "میں آپ آیا نہیں، لایا گیا ہوں"

کی جیسی کوئی صورت شاید پیش آگئی تھی، خود مصنف امام ہی کے الفاظ کو پڑھئے، اس تیسرے حج کا ذکر چھیڑتے ہوئے فرماتے ہیں

"اسی سال ارادہ جناب مولنا مولوی رشید احمد صاحب کا حج کو جانے کا تھا، احقر بھی تیار ہوا۔"

احقر سے مراد خود ہمارے مصنف امام حضرت مولنا محمد یعقوب صدر اول دارالعلوم دیوبند ہیں، مطلب یہی ہے کہ یہ دونوں حضرات تو حج کے لئے خود تیار ہوئے، بلکہ مولنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پہلے ہی سے اس سال حج کرنے کا ارادہ فرما چکے تھے، اب آگے سنئے، وہی سیدنا الامام کے متعلق فرماتے ہیں۔

"چلنے میں مولنا کو بھی ساتھ لے ہی لیا۔"

"لے ہی لیا" کا نحو ہی بتا رہا ہے کہ لے جانے والے جسے اپنے ساتھ لئے جا رہے تھے، خود اس کے اندر اس سال کے حج کے متعلق کسی قسم کا کوئی خیال پہلے سے نہ تھا، اور "دلے برندش" کا ذریعہ عالم میں ان ہی لے جانے والوں کو بنایا گیا۔

اور یہ تو خیر ایک استنباطی نتیجہ ہے، براہ راست خاکسار نے حضرت مولانا حبیب الرحمن اور امیر شاہ خان صاحب وغیرہم حضرات سے جو باتیں اس حج کے متعلق سنی ہیں۔ خلاصہ جن کا یہی ہے کہ مولنا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اس سال حج کے لئے جانے والے ہیں، عام طور پر لوگوں میں اسی کا چرچا اور شہرہ تھا۔ تا اینکہ روانگی کی تاریخ بھی متعین ہو گئی، مولنا گنگوہی کو رخصت کرنے کے لئے سیدنا الامام الکبیر بھی گنگوہ تشریف فرما ہوئے، دونوں رفیق الدنیا والآخرۃ میں جب ملاقات ہوئی، تو حضرت گنگوہی نے رفاقت کی خواہش پیش کی، آپ بالکلیہ اس خیال سے خالی تھے۔ وقت بھی اتنا تنگ ہو چکا تھا کہ اس عرصہ میں زادِ راحلہ اور

دوسری ضرورتوں کی فراہمی کی بظاہر کوئی صورت نہ تھی، حضرت نانوتویؒ کی طرف سے معاذیر جو واقعی معاذیر تھے، پیش ہوتے رہے لیکن دوسری طرف سے اصرار بڑھتا ہی چلا گیا، رات کا بڑا حصہ اسی ردّ و کد میں ختم ہوا اور اسی فیصلہ پر ختم ہوا کہ سامان ہو یا نہ ہو، لیکن بہرحال رفاقت کی جائیگی، کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ حضرت گنگوہیؒ نے بمبئی تک کے مصارف کی ذمہ داری اپنے اوپر لی تھی، آگے کیا ہوگا اس مسئلہ کو اسی کے سپرد کر دیا گیا، جس نے حضرت گنگوہیؒ کے قلب منور میں رفاقت کے اس خیال کو ڈالا تھا،

"ساتھ لے ہی لیا"

مصنف امام کے اس تین تین کی شاید یہی شرح ہے، جو بزرگوں سے مجھ تک پہنچی ہے، ساتھ لینے والوں نے پھر راستہ بھر کیا کیا دیکھا، اور قادر و مقتدر کی اقتداری نیرنگیاں کن کن شکلوں میں سامنے آئیں، ان کا ذکر تو آگے آرہا ہے، اس وقت تو

"میں آپ آیا نہیں لایا گیا ہوں"

کا جو خیال سیدنا الامام الکبیر کے اس آخری وداعی حج کے متعلق میرے دل میں آیا ہے اور یہی آپ کے اس تیسرے حج کی سب سے بڑی خصوصیت کم از کم مجھے جو نظر آئی ہے۔ منجملہ دوسرے اسباب و وجوہ کے اس خیال کا جو واضح منشا بن سکتا ہے، آپ بھی اسے دیکھ رہے ہیں، اور یہی کیا اس تیسرے حج و زیارت کی سعادت جس سال آپکو حاصل ہوئی یاد ہوگا، یہ وہی سال تھا جس میں خدا شناسی کے دوسرے میلے سے سیدنا شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں

"بحمد اللہ نصرت اسلام کا پھریرا اڑاتے ہوئے، حضرت مولانا المعظم و سیدنا الامام الکبیر واپس تشریف لائے" ص۲ دیباچہ حجۃ الاسلام طبع جدید علیگڈھ

میں نے عرض کیا تھا کہ مارچ ۱۸۷۷ء میں آپ خدا شناسی کے دوسرے میلہ سے واپس ہوئے، اور اسی سال کے اواخر ماہ ستمبر یا اوائل ماہ اکتوبر میں دیکھا جا رہا ہے کہ بے سان و گمان، بغیر کسی سابقہ تیاری کے لے جانیوالے اپنے ساتھ حضرت الاکو اللہ کے گھر، اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آستانے کی طرف لئے چلے جا رہے ہیں، ادھر تو یہ لوگ لئے چلے جا رہے ہیں، اور اب میں کیا بتاؤں، افشا کرنیوالے راز کا جب افشا کر ہی چکے ہیں،

قید تحریر ہی میں نہیں، بلکہ چھپ چھپا کر مدت ہوئی عام طور پر شائع و ذائع بھی ہو چکا ہے، تو اسے میں کیوں چھپاؤں، اللہ اللہ آج سے تقریباً آٹھ سال پہلے اپنے دوسرے حج کے موقعہ پر بجائے ایک قبلہ کے مکہ معظمہ میں دوسرے قبلہ کو جو ڈھونڈھ رہا تھا، اور پانے کے بعد خدا کا شکر ان الفاظ میں ادا کرتا ہے کہ مکہ ہی میں

"دونوں قبلوں کی زیارت سے مشرف ہوا"

کیسی عجیب بات ہے کہ اس تیسرے حج میں دیکھا گیا، اپنے ڈھونڈھنے والے کو وہی تلاش کر رہا ہے جو دوسرے حج کے موقعہ پر اس کا دوسرا قبلہ بنا ہوا تھا، صاف لفظوں میں سنئے حضرت تھانوی کی ایک مشہور کتاب "کرامات امدادیہ" بھی ہے، اسی میں انہوں نے الہ آباد کے مشہور عالم و صوفی مولانا محمد حسین الہ آبادی جنکی وفات ہی بحالت وجد وحال اجمیر شریف میں ہوئی، ان ہی کے حوالہ سے یہ روایت درج کی ہے کہ مولانا الہ آبادی کی ایک دوست مولوی افضال الحق نامی تھی، لکھا ہے کہ حضرت حاجی صاحب کے غلاموں میں تھی۔ یہی مولوی افضال الحق بیان کرتے تھے کہ مکہ معظمہ میں

"جن دنوں میں حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر تھا"

یہی زمانہ تھا، جس میں اس تیسرے وداعی حج کیلئے لیجانیوالے سیدنا الامام الکبیر کو اپنے ساتھ لئے ہوئے حجاز کا سفر کر رہے تھے، مولوی افضال الحق صاحب کا بیان ہے کہ اسی عرصہ میں ایک دن یہ واقعہ پیش آیا کہ

"اشراق کی نماز کے بعد مراقبے سے آپنے (یعنی حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے) سر اٹھایا اور فرمایا"

جو کچھ ارشاد فرمایا، اسے سنئے، خود حاجی صاحب مکہ معظمہ میں ہیں، اور ارشاد فرمارہے ہیں کہ

"عجیب نہیں کل مولوی محمد قاسم وغیرہ یہاں آجائیں"

جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، حجاج کا یہ ہندی قافلہ تقریباً ایک سو سے زائد علماء پر مشتمل تھا، خود حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہی اس میں شریک بلکہ گویا میر قافلہ تھے لیکن بجز اس کے جسے لانیوالے اپنے ساتھ لئے آرہے تھے، آنیوالوں میں سے نام کسی کا نہیں لیا جارہا ہے، صرف "وغیرہ" کے لفظ سے ان کی طرف اشارہ اس موقعہ پر کافی سمجھا گیا، اور بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی، مولوی افضال الحق صاحب حضرت حاجی صاحب سے اس خبر کو سنکر جیسا کہ چاہیئے تھا عرض کیا کہ

"کیا کوئی خط آیا ہے؟"

جواب میں جو کچھ فرمایا گیا، اسی کا سنانا مقصود ہے، حالانکہ حاجی صاحب کا جیسا کہ معلوم ہے اس قسم کی باتوں کا اظہار آپ کا عام دستور نہ تھا، لیکن اس وقت رنگ ہی دوسرا تھا، مولوی افضال الحق صاحب سن رہے تھے، مکہ میں بیٹھے بیٹھے حاجی صاحب ان سے کہہ رہے ہیں۔

"مجھے اس وقت (مراقبہ میں) جہاز کا مستول نظر آیا کہ اس نے جدہ میں لنگر کیا، اس جہاز پر غالباً یہ لوگ ہیں"

دوسرے حج میں جو ڈھونڈھا جا رہا تھا، تیسرے حج میں اپنے ڈھونڈھنے والے کو وہی اپنے مراقبہ میں تلاش کر رہا ہے، کیا اس دعوے کے ثبوت کیلئے مزید کسی تشریح کی ضرورت ہے، اپنا حال کیا عرض کروں اس روایت پر جس وقت نظر پڑی، بچپن کا وہ زمانہ یاد آگیا، جب الحماسی کے وہ اشعار پڑھائے گئے تھے جو مکہ میں تھا، اور اس کی محبوبہ یمن کے ناقہ سواروں کے ساتھ جا رہی تھی، اسی کو یاد کر کے "زندان مکہ" میں اس نے چند اشعار کہے تھے، جن میں دو شعر یہ بھی ہیں۔

هوای[1] مع الركب اليمانين مصعد جنيب وجثمانی بمكة موثق

عجبت لمسراها وانى تخلصت الىّ وباب السجن دونى مغلق

شاعر غریب نے تو شاعری کی تھی، لیکن کون جانتا تھا کہ صدیوں بعد اسکے یہی اشعار حقیقت اور واقعیت کا قالب اختیار کریں گے، اس نے صرف خیالی آمد و رفت پر تعجب کا اظہار کیا تھا، لیکن اس کا یہی خیال "واقعہ" بن کر جب ہمارے سامنے آیا ہے، تو ہم بھی صرف یہ کہتے ہوئے ششدر ہو کر رہ جائیں، کہ جو مکہ میں تھا، مکہ میں رہتے ہوئے جدہ کے ساحل تک کیسے پہنچ گیا۔ اور جو لایا جا رہا تھا، اسی کو لینے کیلئے چالیس پچاس میل کا یہ فاصلہ لمحوں میں کیسے طے کر لیا گیا، مولوی افضال الحق صاحب جنھیں استقبال کی اس عجیب و غریب کیفیت سے مطلع کیا گیا تھا، دوسرے دن انھوں نے یہ دیکھا کہ

---

[1] میرا محبوب یمن کے ناقہ سواروں میں چڑھا چلا جا رہا ہے، ہم سے دور، اور میرا جسم مکہ میں مقید ہے، رات کو اس کے آنے پر مجھے حیرت ہے، کہ مجھ تک وہ کیسے پہنچ گیا، حالانکہ میرے اور اس کے درمیان قید خانہ کا بند پھاٹک تھا لطیفہ یہ ہے کہ ہندی حاجیوں کا میقات یلملم وہی ہے، جو یمن والوں کا میقات ہے یعنی اسی میقات سے ہندوستان اور یمن کے حجاج احرام حج باندھ لیتے ہیں

"آپ کے (یعنی حاجی صاحب قبلہ رح کے) فرمانے کے موافق یہ سب لوگ (یعنی سیدنا الامام الکبیر وغیرہ) پہنچ گئے" صلا کراماتِ امدادیہ

پہنچ جانے کے بعد مذکورہ بالا امر اقبانی استقبال کے ساتھ ساتھ دیکھنے والوں نے مکہ معظمہ کے اس دوسرے قبلہ کے ناسوتی استقبال کا نظارہ جس رنگ میں کیا تھا وہ بھی کچھ کم اثر انگیز اور رقت خیز نہ تھا مولانا عاشق الٰہی راوی ہیں کہ

"جس وقت قافلہ باب مکہ پر پہنچا، تو سب نے دیکھا کہ اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب) پٹکے سے کمر باندھے فصیل کے پاس کھڑے ہیں"

وہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ

"باوجود ضعف و نقاہت کے سنت استقبال اور جوش محبت میں شہر سے باہر ملنے کی خواہش پوری کئے بغیر نہ رہ سکے، خدا جانے کس وقت سے منتظر کھڑے تھے اور راستہ کی جانب آنے والے قافلہ کا انتظار کر رہے تھے" صـ۲۳ تذکرۃ الرشید

جو لایا جا رہا تھا جب وہی اپنے لانے والے ساتھیوں کے ساتھ "چشم سر" کے سامنے بھی آگیا، تو پھر دیکھنے والوں نے کیا کیا دیکھا، اس کا ذکر انشاء اللہ تعالیٰ ہم آئندہ کریں گے۔

اس وقت تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ خود آنے کا ارادہ جس نے اس سال نہیں کیا تھا لیجانیوالے اس کو کس طریقہ سے لئے جا رہے تھے اور مکہ میں اپنا دوسرا قبلہ جس ذات بابرکات کو وہ بنا رہے تھے تھا، وہی لانے کیلئے آپ دیکھ رہے ہیں کیا کیا نہیں کر رہا ہے، رحمۃ اللہ علیہم

اگرچہ اور تو کسی نے ذکر نہیں کیا ہے لیکن اسی "وداعی حج" کے رفقاء میں سیدنا الامام الکبیر کے تلمیذ سعید مولانا حکیم منصور علی خاں حیدرآبادی بھی تھے، انھوں نے اپنی کتاب "مذہب منصور" میں ذیلاً اس "آخری حج" کے بعض حالات اور واقعات کا بھی تذکرہ فرمایا ہے اسی سلسلہ میں ایک اجمالی اطلاع وہ یہ بھی دیتے ہیں کہ

"۱۲۹۴ھ ہجری میں اخیر حج اپنے والد ماجد کی طرف سے کیا تھا" صـ۱۷۹

جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے، کہ اپنے اس تیسرے حج کے ثواب کو سیدنا الامام الکبیر نے نیت کرلی تھی

کہ ان کے والد ماجد مرحوم تک پہنچے' اور اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آمادہ کرنیوالوں نے جب آمادہ ہی کر لیا' تو آپ نے چاہا کہ اپنے اس حج کا فائدہ اور ثواب اپنے والد مرحوم کو پہنچا دیا جائے گویا حج تو آپ نے والد مرحوم کی طرف سے کیا' ہی آپ کی ذات' سو آپ خود گئے کب تھے' بلکہ آپ پڑھ چکے کہ لے جانیوالے آپ کو لے گئے' اور کون کہہ سکتا ہے کہ خدا شناسی کے میلہ کے اختتام کے ساتھ ہی آپ کی طلبی کی جو غیبی صورتیں پیش آگئیں' بلانیوالے کی غرض اس سے کیا تھی؟ میدان جیتتے تھے' تو کیا اسی کے صلہ و انعام کے لئے دربار الٰہی اور آستانہ نبوت تک طلب کئے گئے تھے؟ یہ راز و نیاز کی باتیں ہیں' قرائن و قیاسات سے کچھ کہنا اپنی حد سے آگے بڑھنا ہے' اسی لئے اس قصہ کو اسی حد پر ختم کر کے اس آخری حج میں دیکھنے والوں کو جو کچھ دکھایا گیا' ان ہی کے ذریعہ ہم تک جو کچھ بھی پہنچ سکا ہے اسے پیش کر دیتا ہوں۔

"چلنے میں مولانا کو ساتھ لے ہی لیا" عرض کر چکا ہوں کہ ساتھ لیجانیوالوں کا یہ فیصلہ گنگوہ میں ہو چکا تھا' اسی فیصلہ کے مطابق سیدنا الامام الکبیر گنگوہ سے پہلے وہاں تشریف لائے' جہاں آپ کے اہل و عیال اس زمانہ میں مقیم تھے' اب خواہ وہ نانوتہ ہو' یا دیوبند' غالب خیال یہی ہے' کہ اس زمانہ میں آپ کے گھر کے لوگ نانوتہ میں تھے' گھر پہنچکر اچانک آپ نے حجاز کے اس تیسرے سفر کا اعلان کیا' سنا گیا ہے کہ جو جوڑا جسم مبارک پر تھا' اسکے سوا دوسرا جوڑا دھوبی کے یہاں تھا' وہ منگوایا گیا' جیب میں کچھ روپے پڑے ہوئے تھے' اہلیہ محترمہ کے ہی حوالہ کئے گئے اور کہہ دیا گیا کہ مقامی ذرائع اور وسائل سے گھر کے مصارف کو واپسی تک چلاتی رہیں' سہارنپور کا اسٹیشن جہاں سے مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رفقاء کے ساتھ ریل پر سوار ہونیوالے تھے۔ طے پایا تھا کہ وہیں آپ بھی فلاں تاریخ کو پہنچ جائیں' گھر سے رخصت ہو کر سہارنپور پہنچنے کیلئے روانہ ہوئے لیکن کس شان کے ساتھ روانہ ہوئے ہزار ہا ہزار میل کا سفر کرنا ہے لیکن جیب میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے' ساز و سامان بس بدن کے جوڑے کے سوا یہی دوسرا دھلا ہوا جوڑا تھا' ممکن ہے ایک دو لنگیاں اوڑھنے بچھانے کیلئے ایک آدھ کمبل چادر وغیرہ بھی ہو' الغرض اسی تفریدی شان اور تجریدی آن کے ساتھ آپ بھی سہارنپور پہنچ گئے یہاں پہنچنے کے بعد ایک عجیب تماشا پیش ہوا' خیال تو صرف یہ تھا کہ حضرت گنگوہی اپنے خاص خدام کے ساتھ ہونگے' لیکن دیکھا یہ گیا' جیسا کہ مولانا عاشق الٰہی مرحوم نے لکھا ہے کہ ایک مولانا گنگوہی کیا' بلکہ

"سرزمین ہندوستان کے منتخب چیدہ علماء سب ہی معیت کیلئے طیار ہو گئے" ص ۲۲۹ تذکرۃ الرشید

مطلب یہ ہے کہ مشائعت اور پہنچانے کیلئے سہارنپور کے اسٹیشن پر انسانوں کا جو سیلاب امنڈ پڑا تھا، وہ تو بجائے خود تھا، اور جس قسم کے نفوس طیبہ سفر حج کیلئے جا رہے تھے، انکو رخصت کرنے کیلئے جتنا بڑا مجمع بھی اکٹھا ہو جائے، یہ تو خیر عام اور معمولی بات ہے، بلکہ حیرت کی جو بات تھی وہ یہ تھی کہ عوام ہی نہیں بلکہ وقت کے چیدہ اور برگزیدہ علماء اور صلحاء کی ایک بڑی تعداد سفر میں ہمرکابی کیلئے اسٹیشن پر موجود تھی، جن میں چند کے نام جیسا کہ تذکرۃ الرشید میں ہے، یہ تھے۔

"حکیم ضیاء الدین (رامپور منہیاران)، مولانا محمد مظہر نانوتوی (صدر مظاہر علوم سہارنپور)، مولانا محمد اسماعیل صاحب (کاندھلہ)، مولوی سخاوت علی انبیٹھوی، مولانا حافظ عبد العدل (گلاوٹھوی) مولانا محمد منیر صاحب (نانوتوی) مولوی الطاف الرحمٰن، حاجی عبد المجید گنگوہی، حاجی ظہور احمد انبیٹھوی"

انکے سوا دار العلوم دیوبند کے صدر اول یعنی مولانا محمد یعقوب صاحب، اور دار العلوم ہی کے مہتمم مولانا رفیع الدین صاحب نیز حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہم اجمعین بھی تھے، بہرحال علاوہ عام لوگوں کے مولوی عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ

"سارا قافلہ کچھ اوپر سو حضرات کا تھا" ص ۲۲۹

ان بزرگوں میں سے بڑی تعداد تو سہارنپور ہی کے اسٹیشن پر پہنچکر رفاقت کا حق ادا کرنے کیلئے حاضر ہو گئی تھی، اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو پہلے ہی سے راہی بمبئی ہو چکے تھے، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے اطلاع دی ہے، کہ

"مولانا محمود حسن و حکیم محمد صاحب (شیخ الہند کے بھائی) اور مولانا رفیع الدین صاحب ۷ شوال کو وطن (دیوبند) سے روانہ ہو کر بمبئی پہنچ گئے تھے"

اور جو نہ آگے روانہ ہو سکے اور نہ سہارنپور پہنچنے کا موقعہ ان کیلئے باقی رہا، ان ہی کا بیان ہے کہ ان لوگوں کے لئے،

"جس ریلوے اسٹیشن سے ساتھ ہو نا آسان ہوا، سوار ہوئے، اور آگے پیچھے بھی روانگی بہ نیت معیت وہمرکابی کا تار بندھا رہا" ص ۲۳ ج ۱ تذکرۃ الرشید

ایک دفعہ ہندوستانی علماء کی اتنی بڑی تعداد حجاز کے اس سفر میں ساتھ دینے کیلئے کیوں تیار ہو گئی تھی؟ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے اس سوال کو اٹھا کر جو جواب دیا ہے، وہ بجائے خود حیرت انگیز، اور سمجھا جائے تو ایک خاص انکشاف ہے

جس کا ذکر ان کی کتاب کے سوا شاید سننے میں نہیں آیا۔

اتنی بات تو صحیح ہے، کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب یہ قافلہ ہندوستان سے روانہ ہوا ہے، ترکی حکومت اور روس کے درمیان وہ معرکۃ الآراء جنگ چھڑی ہوئی تھی، جس میں پلونا نامی مقام کی لڑائی کو کافی شہرت حاصل ہوئی اسی جنگ میں غازی عثمان پاشا ترکی سپہ سالار نے خود اپنی اور اپنی فوج کی سرفروشیوں اور جاں بازیوں کے لازوال نقوش اسلامی تاریخ کے اوراق پر چھوڑے، بہرحال اسی مشہور لڑائی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ یہ حضرات (یعنی حضرت گنگوہی و نانوتوی) دینی معاونت کے لئے بحیلہ سفر حجاز حقیقت میں ملک روم (ترکی) کا سفر کر رہے ہیں، اور ترکی سلطنت کی طرف سے والنٹیر جماعت میں شامل ہوکر مجاہد فی سبیل اللہ بنیں گے۔" ص ۲۲۹/۱ تذکرۃ الرشید

گویا حج سے زیادہ جہاد فی سبیل اللہ کا ولولہ ان لوگوں میں جوش زن تھا جنکی رفاقت کا بقول مولانا عاشق الٰہی

"تار بندھا ہوا تھا۔"

نقل کرنے کی حد تک مولانا نے اس کو نقل کر دیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ آخر میں اس پھیلے ہوئے خیال کو خود انہیں نے قرار دیا ہے، کہ "بے بنیاد" تھا، اپنی رائے بھی درج کی ہے، کہ بجز حج و زیارت اور کسی قسم کا کوئی مقصد اس سفر کا ان بزرگوں کے پیش نظر نہ تھا۔

ظاہر ہے کہ اس خیال کے راوی بھی وہی ہیں، اور وہی جب اسے بے بنیاد ٹھیرا رہے ہیں تو ہم اس کے متعلق اور کیا سمجھیں یا کیا مانیں، تاہم خیال بجائے خود بے بنیاد ہی کیوں نہ ہو[۱]، لیکن اسی خیال کے زیر اثر

---

[۱] لیکن اسی کتاب میں اسی سفر کے اختتام کا تذکرہ کرتے ہوئے مولوی عاشق الٰہی صاحب نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حج و زیارت سے فارغ ہونے کے بعد حجاز سے واپسی کا ارادہ یہ لوگ کرہی رہے تھے کہ اچانک یہ خبر مکہ معظمہ میں پہنچی کہ پلونا میں ترکی کو شکست ہوئی اور روس نے پلونا فتح کر لیا" یہ خبر ملنے کے ساتھ مجمع پر افسردگی طاری ہوگئی، اور واپسی کا جو ارادہ تھا، وہ ملتوی کر دیا گیا، بعد کو حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرماتے ہوئے کہ

"جو مقدر تھا ہوا، اور جو ہونا ہے ہو کر رہے گا۔"

ہندوستان واپس ہونے کا جب حکم دیا، تب یہ لوگ واپس ہوئے (دیکھو تذکرۃ الرشید ص ۲۴۱) غالباً اسی واقعہ کا ذکر کسی موقعہ پر میں کر بھی چکا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ پلونا کی شکست کے اس قصے کو جب اس پھیلے ہوئے خیال سے ہم ملاتے ہیں جس کا ذکر مولوی عاشق الٰہی نے کیا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پھیلے ہوئے خیال کو کلیۃً بے بنیاد کیسے مان لیا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب ۱۲

قافلہ میں شریک ہونیوالے ہندی مسلمانوں کے ایمان واخلاص کی یہ یادیں کی گئی ہیں ان کا جو سراغ مولانا عاشق الٰہی کی اس روایت سے مل رہا ہے، وہ آج کل کے سطح الوں کیلئے ہیجان انگیز حیرت ہے، ٹکڑا مالت اور ظلم کے طوفانوں کا عرض وطول خواہ جتنا زیادہ بڑھا ہوا نظر آرہا ہو، لیکن ان کی ناگیرائی میں ان کا جو حال ہے اس سے ہم میں شاید کوئی خود واقف ہو یا سوچے تو واقف ہو سکتا ہے، جو بولتے نہیں تھے، کرنے کیلئے وہ کہاں تک جانے کیلئے بیچین اور مضطر تھے، اور بولنے یا لکھنے کے سوا جن مسلمانوں کا شاید کوئی دوسرا مشغلہ باقی نہیں رہا ہے، اپنے دلوں سے ان کو پوچھنا چاہئے کہ کرنے کیلئے کہاں تک جانے کی ہمت کر سکتے ہیں، مگر کیا کیجئے کہ ان ہی گذری ہوئی نسلوں پر آج الزام لگایا جا رہا ہے کہ ان کا اسلام صرف نماز اور روزہ تک محدود تھا، پورے کا پورا جیسا کہ وہ ہے اس سے بے گانہ ہو چکے تھے۔[۱]

بہر حال سہارنپور کے اسٹیشن سے سوار ہونے والے حجاز کے مسافر اپنے اپنے ٹکٹ لے کر گاڑی میں سوار ہو رہے تھے، ان ہی مسافروں میں ایک مسافر وہ بھی تھا، جو آخر تک ان لوگوں کے ساتھ سفر میں ساتھ دینے کے لئے اسٹیشن پر حاضر ہوا تھا، لیکن جیب میں اس کے پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، بمبئی تک کا ٹکٹ تو مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے حسب وعدہ خرید لیا گیا تھا، آپ کو پتہ بھی نہ چلا کہ ٹکٹ کس نے لیا، اور کتنے میں لیا، تذکرۃ الرشید میں مولانا عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت گنگوہی نے

---

[۱] اس سلسلہ میں سیدنا الامام الکبیر کے ان قصائد کا مطالعہ مفید ہوگا، جو سلطان عبد الحمید خاں مرحوم کی شان میں عربی زبان میں منظوم ہوئے تھے، آپ کے ان قصائد کے ساتھ شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا ذوالفقار علی اور مولانا فخر الحسن اور مولانا محمد یعقوب صاحب یعنی ہمارے مصنف امام کے قصائد بھی جو عربی زبان میں لکھے گئے تھے، ان کا مجموعہ طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے، سیدنا الامام الکبیر کے اشعار میں چند اشعار عربی قصیدہ میں یہ فرماتے ہوئے کہ

لولا مهالك في مهالك دونكم	من دونها اخرى وهن كذلكم
وموانع وعلائق وعوائق	عاقت مني عرض المنى بحيالكم

ارشاد ہوا ہے کہ

لرئتنا وخورنا كسيوفكم	من دون تحرك عصمة لاتالكم

یہ قصیدہ اس زمانہ میں لکھا گیا تھا، جب غازی عبد الکریم پاشا نے کا میدان جیتا تھا، ایسی صورت میں یلونا والی لڑائی میں شرکت کا ولولہ ان حضرات کے قلوب میں موجزن ہوا ہو، تو اسے مستبعد نہیں قرار دیا جا سکتا ۱۲

"اپنے مجمع کو ساتھ لے کر بارہویں شوال (۱۲۹۴ھ) کو سہارن پور کے اسٹیشن پر ریل پر سوار ہوئے" صفحہ ۲۷

اس مجمع میں مولانا گنگوہی ہی کے خریدے ہوئے ٹکٹ کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر بھی تھے۔ اسی کے بعد جو کچھ دیکھا گیا، خاکسار نے براہ راست مولانا حبیب الرحمن صاحب (سابق مہتمم دارالعلوم) رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی جو کچھ سنا ہے، اور آج تک بحمد اللہ وہ محفوظ ہے، صرف اتنی بات صحیح طور پر یاد نہ رہی کہ مولانا حبیب الرحمن صاحب نے خود اس تماشے کو دیکھا تھا، یا دیکھنے والوں سے سنا تھا،

سیدنا الامام الکبیر ریل پر جس وقت سوار ہوئے، اس وقت آپ کے پاس کچھ نہ تھا، لیکن جوں ہی کہ سہارنپور سے گاڑی آگے بڑھی، مولانا حبیب الرحمن صاحب فرماتے تھے، کہ کچھ نہیں معلوم کہ کس نے یہ خبر پھیلا دی کہ فلاں گاڑی سے مولانا نانوتوی، سفر حج کے لئے جارہے ہیں، نتیجہ یہ تھا کہ جس قابل ذکر اسٹیشن پر بھی گاڑی ٹھیرتی تھی، خلق اللہ کا ایک ہجوم اس پر نظر آتا تھا، لوگ مولانا کو ڈھونڈتے ہوئے اس ڈبے تک پہنچتے تھے جس میں آپ جلوہ فرما تھے۔ ملاقات و مصافحہ کے بعد ملنے والے عام ہدایا اور تحف کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی استطاعت اور ہمت کے مطابق حضرت والا کی خدمت میں رقمیں بھی پیش کرتے چلے جارہے ہیں۔ کہتے تھے کہ پھلوں اور مٹھائیوں کا ڈھیر تھا، جو جمع ہوگیا تھا۔ غازی آباد پہنچ کر گاڑی بدلنی پڑی، وہاں سے الہ آباد جانے والی گاڑی پر لوگ سوار ہوئے، راستہ میں پھر وہ تماشا پیش نظر تھا۔ اسٹیشنوں پر لوگ آرہے ہیں، اور کچھ پیش کر کر کے جارہے ہیں۔ تاآنکہ گاڑی اٹاوہ کے اسٹیشن پر پہنچی۔ رفقاء سفر میں جیسا کہ بیان کرچکا ہوں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے صدر اول مولانا محمد مظہر نانوتوی بھی اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ تھے۔ ان کی بیوی صاحبہ کے بھائی اٹاوہ میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھے، ان کا اصرار ہوا کہ ایک شب کی دعوت سارے قافلہ کی میری طرف سے منظور کی جائے،

مولٰنا محمد مظہر کی شخصیت کی وجہ سے لوگوں کو اتر جانا پڑا۔ اٹاوہ کے ایک رئیس نواب ممتاز علی خاں بزرگوں کے اس مجمع کو اپنے شہر میں پاکر مُصر ہوئے کہ ان کی خاطر سے دو دن قافلہ کی مہمان داری کی سعادت وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، نواب صاحب کی یہ درخواست کچھ ایسے اخلاص اور الحاح کے ساتھ پیش ہوئی کہ وہ بھی مسترد نہ ہو سکی۔ اٹاوہ سے پھر یہ مجمع ریل پر سوار ہوا، اور بقول مولٰنا عاشق الٰہی

"جس اسٹیشن پر گاڑی ٹھہرتی، زیارت کے شوق میں بھرا ہوا اہلِ اسلام کا مجمع استقبال کرتا ہوا نظر آتا، اور جس کے نصیب میں یہ معیتِ مبارکہ مقدر ہو چکی تھی، وہ اجازت لے لے کر ساتھ ہوتا جاتا تھا۔" ص۲۳

گاڑی الہ آباد پہنچی۔ الہ آباد سے جبل پور جانے والی گاڑی پر بمبئی جانے والوں کو سوار ہونا پڑتا تھا، مگر اس زمانہ میں ریلوے کا یہ عجیب دستور تھا، جس کے راوی مولٰنا عاشق الٰہی ہیں، یعنی الہ آباد سے جبل پور دو گاڑیاں روانہ ہوتی تھیں، جن میں ایک تو ڈاک گاڑی تھی، وہ تو حسبِ دستور سیدھے بمبئی چلی جاتی تھی، لیکن دوسری گاڑی (پسنجر) کے متعلق اس زمانہ

لہ مولوی عاشق الٰہی صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹاوہ میں مولوی مظہر صاحب کی وجہ سے قافلہ کا اترنا خط و کتابت کے ذریعہ سے پہلے سے طے شدہ تھا۔ اسی لئے مولٰنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بجائے بمبئی کے اپنے اور اپنے رفقار کا ٹکٹ اٹاوہ ہی تک کا لیا تھا۔ مگر بعض لوگ جو اٹاوہ کی منزل سے ناواقف تھے، بمبئی تک کا ٹکٹ ان کے پاس تھا۔ اسی لئے اٹاوہ میں جب قافلہ اترنے لگا تو ٹکٹ کی مجبوری کی وجہ سے ان لوگوں نے معذرت چاہی جن کے پاس بمبئی تک کا ٹکٹ تھا" نواب ممتاز علی صاحب جو خود پلیٹ فارم پر استقبال کے لئے آئے ہوئے تھے، ان کو جب یہ معلوم ہوا تو سب کو اتار لیا، اور ٹکٹ کے متعلق کہا کہ آپ لوگ بے فکر رہیں، میں سب کچھ کر لوں گا۔ یہی کیا گیا جب لوگ اٹاوہ سے چلنے لگے تو بمبئی تک ٹکٹ والوں کو جدید ٹکٹ کی ضرورت نہ ہوئی، طویل سفر میں سفر کو مسافر منقطع کر سکتا ہے، یعنی بریک جرنی کے قانون کا یہ نتیجہ تھا، یا نواب صاحب نے اٹاوہ سے بمبئی تک کیلئے نیا انتظام کیا، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ اس کا پتہ نہ چل سکا، اگر دوسری صورت پیش آئی تو نواب صاحب کی فراخ چشمی کی یہ دلیل ہے ۱۲

میں جیسا کہ وہی لکھتے ہیں یہ قاعدہ تھا کہ

"دن بھر چلتی تھی، اور جس اسٹیشن پر رات ہو جاتی تھی، وہیں شب گذارتی تھی" ص۲۳۱

قدرتاً دوسری گاڑی میں وقت زیادہ صرف ہوتا تھا، لیکن کرایہ اس کا کم تھا، اور ڈاک گاڑی کا کرایہ زیادہ تھا۔ الہ آباد پہنچنے کے بعد رائے اور مشورہ سے یہی طے ہوا کہ ڈاک گاڑی ہی میں سفر کیا جائے، قافلہ میں آدمی کافی تھے، مولوی عاشق الٰہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ حاجیوں کے لئے اسپیشل ٹرین کا بندوبست کر لیا گیا اور کرایہ

"سارے قافلہ پر منقسم کر دیا گیا"

حساب سے ان ہی کے بیان کے مطابق الہ آباد سے

"بمبئی تک کا کرایہ فی کس پچیس روپیہ پڑا"

اس انتظام کی وجہ سے اور سہولتیں جو پہنچیں، ان کے سوا سب سے بڑا اثر انگیز نظارہ راستہ کے ان اسٹیشنوں پر پیش ہوتا تھا، جہاں نماز کا وقت آجاتا تھا، مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ وضو وغیرہ کا انتظام تو لوگ پہلے ہی کر لیتے تھے، اور

"اکثر نماز با جماعت ریلوے اسٹیشن پر اتر کر ایسی جگہ ادا کی جاتی تھی جہاں ریل کا قیام باطمینان، فراغت نماز تک مقرر ہو" ص۲۳۳

لیکن جہاں اتر کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا موقعہ نہ ملتا، تو مولوی صاحب نے لکھا ہے، کہ ریل ہی پر نماز پڑھ لی جاتی۔ خواہ ٹھیری ہوئی ہو یا چل رہی ہو، لیکن ہر حال میں جو نماز بھی ادا کی جاتی تھی وہ

"جماعت کے ساتھ"

ادا ہوتی تھی، مگر اسی کے ساتھ اس کی بھی اجازت تھی کہ جو

"کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکتے وہ بیٹھ کر پڑھتے تھے"[1]

[1] بظاہر اس سے شخصی اعذار مراد ہیں ورنہ محض ریل کی حرکت سقوطِ قیام کے لئے عذر شرعی نہیں ہے۔ محمد طیب غفرلہٗ

اسی طرح

"جن کو پانی نہ مل سکا تھا وہ تیمم کرتے اور نماز میں شریک ہو جاتے"

عموماً امامت حضرت گنگوہی یا ہمارے مصنف امام ربانی حضرت مولانا محمد حبیب صاحب کے سپرد تھی، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ مولانا سخاوت علی نامی کوئی بزرگ امام بنائے گئے، نماز ریل سے اتر کر ادا کی جا رہی تھی۔ مولوی سخاوت علی صاحب نے قرأۃ میں کچھ طوالت سے کام لیا۔ سلام سے جب فارغ ہوئے تو دیکھا گیا کہ حضرت مولانا گنگوہی ان سے فرما رہے ہیں کہ

"کہیں ایسی نماز ایسے سفر میں پڑھی جاتی ہے" ص۲۳۳

الغرض حاجیوں کی یہ اسپیشل ٹرین ایک تماشہ تھی، ٹرین اپنی منزل کے ساتھ ساتھ دین و اسلام کی تعلیم بھی لوگوں کو مسلسل مل رہی تھی۔ اور ظاہر ہے ساتھ ساتھ ان بزرگوں کے باطنی کمالات کی تجلیوں سے نگاہیں خیرہ ہو رہی تھیں، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ

"راستہ میں بہتیری کرامتیں ان حضرات سے صادر ہوئیں" ص۲۳۳

لیکن باوجود جاننے کے افسوس ہے، مولانا نے اختصار کی راہ اختیار کی، صرف ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، جسے ہم بھی درج کر دیتے ہیں، اسٹیشن کا نام تو نہیں لکھا ہے، بہرحال جبل پور بمبئی لائن کے درمیانی اسٹیشنوں میں سے کوئی اسٹیشن تھا جہاں گاڑی طلوع آفتاب سے پہلے ٹھیک نماز صبح کے وقت پہنچ کر رکتی تھی، یہ خیال کر کے کہ گاڑی ابھی ٹھیرے گی، صبح کی نماز گاڑی سے اتر کر لوگ پڑھنے لگے، امامت حضرت مولانا گنگوہی فرما رہے تھے۔ نماز ہو ہی رہی تھی کہ گاڑی نے سیٹی دے دی، بیچارے عام نمازیوں میں سیٹی کی وجہ سے کافی خلفشار برپا ہو گیا، جن کے دل کمزور اور اختلاج کے مریض تھے، ان سے نہ رہا گیا، اور نیت توڑ گاڑی میں یہ کہتے ہوئے جا بیٹھے کہ

"خوب نماز پڑھی، بھئی خوب نماز پڑھی"

لیکن خود حضرت گنگوہی اور آپ کے ساتھ نمازیوں کی کافی تعداد سیٹی کی آواز سے قطعاً بے پرواہ ہو کر نماز ہی میں مشغول رہے حضرت گنگوہی کے نواسے مولانا حبیب الرحمن جو ان نمازیوں میں شریک تھے، نماز ہی میں [illegible] کہتے تھے کہ

"ادھر نماز ہو رہی تھی، اور ادھر گاڑی چیخ رہی تھی، مگر ایک قدم آگے کو سرک نہیں سکتی تھی"

وہی یہ بھی کہتے تھے کہ

"۱۷ منٹ کا وقفہ ہوا"

یعنی مقررہ وقت گاڑی کا جو تھا، اس پر سترہ منٹ گذر گئے، انجن آگے نہیں بڑھ رہا تھا، آخر باطمینان تمام سلام پھیر کر جب سارے نمازی گاڑی میں سوار ہو گئے، تب چیخنے والا انجن بھی متحرک ہو گیا۔

خدا ہی جانتا ہے، کہ اس سلسلہ میں دیکھنے والوں نے اور کیا دیکھا، ان کو کیا کیا دکھایا گیا، البتہ سیدنا الامام الکبیر کی حد تک یہ کہہ سکتا ہوں، کہ حاجیوں کی یہی "اسپیشل ٹرین" جب بمبئی پہنچی، تو اسٹیشنوں پر پہنچ پہنچ کر پیش کرنے والے حضرت والا کی خدمت میں جو کچھ پیش کر رہے تھے، جن صاحب کے پاس یہ رقمیں جمع ہو رہی تھیں، انہوں نے حساب کر کے حضرت والا کو اس کی میزان سے جب آگاہ کیا۔ تو مولانا حبیب الرحمن صاحب کی زبانی فقیر نے سنا ہے، کہ میزان سے مطلع ہونے کے بعد آپ نے حکم دیا کہ فلاں فلاں صاحب کو تار دے دیا جائے کہ حج کا ارادہ ہو تو میرے پاس بمبئی پہنچ جائیں۔ تعداد تو مولانا حبیب الرحمن صاحب مرحوم نے نہیں بتائی تھی، لیکن کافی لوگ تھے، جن کے نام تار روانہ کئے گئے، ایک غیر مترقبہ نعمت تھی۔ لوگ تار پانے کے ساتھ ہی چل پڑنے پر آمادہ ہو گئے اور آگے پیچھے بمبئی پہنچتے چلے گئے۔ ان ہی بلائے ہوئے حضرات کی وجہ سے ایک قصہ

بھی پیش آیا، جس کا ذکر مولوی عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الرشید میں بھی کیا ہے۔

مطلب یہ ہے، عرض کر چکا ہوں کہ سہارنپور ہی کے اسٹیشن سے حجاج کا یہ قافلہ ۱۲ شوال کو روانہ ہوا تھا، گذر چکا کہ دو تین دن اٹاوہ میں بھی صرف ہوئے، کم از کم تین دن اور بھی بمبئی تک پہنچنے میں خرچ ہوئے ہوں گے۔ گویا سمجھنا چاہئے کہ شوال کے دو عشرے بمبئی پہنچتے پہنچتے ختم ہو چکے تھے، اور گو اس زمانہ میں دخانی جہازوں سے سمندر کا راستہ طے ہونے لگا تھا، بادبانی جہازوں کے حساب سے نسبتاً جدہ لوگ بہت کم وقت میں پہنچ جاتے تھے، لیکن پھر بھی دخانی جہازوں کے رواج کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ریل ہی میں آپ دیکھ چکے کہ پسنجر ٹرین اس زمانہ میں صرف دن کو چلتی تھی، اور شب گذاری کے لئے رات بھر کسی اسٹیشن پر ٹھیر جاتی تھی، کچھ یہی حال دخانی جہازوں کا بھی تھا، اور وہ بھی غریب حاجیوں کا جہاز، جس کے ساتھ طرح طرح کے شاخسانے لگے ہوئے تھے، کہیں قرنطینہ ...... کی مصیبت تھی، کہیں کچھ تھا، کہیں کچھ تھا۔ رفتار میں بھی اتنی سرعت پیدا نہیں ہوئی تھی۔

بہرحال بمبئی تک تو حاجیوں کا قافلہ پہنچ گیا، عام خیال یہی تھا کہ تین چار دن میں جہاز مل جائے گا، لیکن سنئے مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"بمبئی پہنچ کر قافلہ کو بائیس دن تک ٹھیرنا پڑا"

جس کے معنی یہی ہوئے، کہ شوال کا مہینہ ہی نہیں بلکہ ذیقعدہ کا بھی ایک عشرہ بمبئی ہی میں

لہ قرنطینہ کی مصیبت کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ فقیر جس زمانہ میں حج و زیارت کے شرف سے مشرف ہوا، اس سال جزیرہ کامران میں صرف ایک دن کے لئے حاجیوں کو اتارا گیا، اور دوسرے دن ہم لوگ جہاز پر سوار ہو گئے، لیکن اسی کتاب تذکرۃ الرشید میں مولوی عاشق الٰہی صاحب نے حضرت گنگوہی کے تیسرے حج کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"دس دن تک قرنطینہ میں حاجیوں کو ٹھیرنا پڑتا تھا۔ جہازوں کی رفتار کا حال یہ تھا کہ عدن تک سات دن میں جہاز پہنچا تھا" ص ۲۲۱ ج ۱

گذرر ہا تھا، اس زمانہ کے بحری سفر کی نزاکتوں کا اندازہ کرتے ہوئے، سوچئے کہ قافلہ والوں پر کیا گذر رہی ہوگی، بقول مولوی عاشق الٰہی صاحب قافلہ والوں کو

"جہاز کا انتظار تھا، مگر اگبوٹ تھا کہ آنے کا نام نہ لیتا تھا، لوگ گھبراتے اور تنگ آئے جاتے تھے" ص۲۳۵

جن لوگوں نے چند دن پہلے دیکھا کہ سیٹی دینے کے بعد بھی ڈاک گاڑی "روک لی گئی" اور تقریباً آدھ گھنٹہ تک صرف چیختی ہی رہی تھی، ان ہی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بمبئی پہنچنے کے بعد آخر یہ رکاوٹ کیوں پیدا ہورہی ہے۔ آخر وہی خدا اس اگبوٹ کو کیوں نہیں بھیج رہا ہے، جس نے چلنے والے انجن کو روک لیا تھا، صبر کا پیمانہ جب قافلہ والوں کا لبریز ہوگیا، تب اور کسی کو تو جرأت نہ ہوئی، لیکن ہمارے مصنف امام جو سیدنا الامام الکبیر کے محرم راز ہونے کے ساتھ ساتھ بہر حال استاذ زادے بھی تھے، ان سے نہ رہا گیا، اور اگبوٹ کی تاخیر کا جو راز تھا اس کا افشاء انہوں نے کر ہی دیا۔ قافلہ کی پریشانی کو دیکھ کر جیسا کہ مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے،

"ایک دن مولٰنا محمد یعقوب صاحب (قافلہ والوں سے) فرمانے لگے کہ آج معلوم ہوا ہے کہ سارے قافلہ کو مولٰنا محمد قاسم صاحب روک رہے ہیں"

کیوں روک رہے ہیں؟ "تار دے کر جو بلائے گئے تھے" ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ

"ان کے (یعنی مولٰنا محمد قاسم صاحب کے) چند رفقاء و متوسلین ضلع مظفر نگر سے آنے والے ہیں، جب تک وہ نہ آجائیں گے، اس وقت تک نہ جہاز آوے نہ جاوے" ص۲۳۵

اور یہی دیکھا بھی گیا، مولوی عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ

"چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ مظفر نگر کا قافلہ جب [illegible] بمبئی پہنچا [illegible]
ایک جرمنی جہاز کا حاجی قاسم صاحب نے بندرگاہ پر شام ہی کو ٹکٹ
کھول دیا" [illegible]

واللہ اعلم بالصواب۔ مظفر نگر کے قافلہ کے نام [illegible] آدمیوں
پر مشتمل تھا۔ لیکن "قافلہ" کے نام [illegible] کافی
تعداد ہوگی، یہ بھی صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ اس قافلہ میں [illegible] ہوتار
پر بلائے گئے تھے، یا ان کے ساتھ اور بھی کچھ لوگ شریک ہو گئے تھے۔ ارواح
طیبہ میں میر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ سے یہ روایت درج کی گئی ہے کہ حج کے
اسی سفر کے موقعہ پر مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں "ایک گروہ" حاضر ہوا،
اور اپنی یہ آرزو پیش کی

"ہم بھی آپ کے ہمراہ حج کو چلیں گے"

لیکن زادِ راہ کے متعلق جب اس "گروہ" سے دریافت کیا گیا، تو جواب میں انہوں
نے کہا کہ

"ایسے ہی توکل پر چلیں گے"

یہ سن کر مولانا گنگوہی نے برافروختہ ہو کر ان لوگوں سے کہا کہ

"جب ہم جہاز کا ٹکٹ لیں گے، تو تم منیجر کے سامنے توکل کی
پوٹلی رکھ دینا"

گویا وہی بات جو کتابوں میں ملتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے بھی
"توکل" کا نام لے کر کچھ لوگ حج کرنے پر آمادہ ہوئے تھے، کہتے تھے کہ نحن
متوکلون (ہم لوگ توکل کرنے والے ہیں) حضرت عمرؓ نے ان کی زبانوں سے یہ
سن کر فرمایا تھا کہ بل انتم متاکلون (بلکہ تم لوگ کھانے والے ہو) گویا یہی

کھانے پینے ہی کا ایک ڈھنگ[1] ہے" امیر شاہ خاں کہتے تھے کہ حضرت گنگوہی نے ان لوگوں سے یہ بھی فرمایا تھا کہ

"بڑے آئے توکل کرنے، جاؤ، اپنا کام کرو۔"

بظاہر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہی پہنچنے کے بعد یہ صورت پیش آئی ہو، کیونکہ اسی روایت میں ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے مایوس ہونے کے بعد یہی گروہ مسلمانوں کا سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اپنی وہی تمنا حج کرنے کی ظاہر کی۔ تار دے کر جو بلائے جا چکے تھے وہ تو بلائے ہی جا چکے تھے، اب مسلمانوں کا یہ نیا گروہ آپ کے سامنے آگیا۔ اگر مصارف کی پابجائی کی کوئی صورت نہ ہوتی تو ظاہر ہے کہ جو جواب ان لوگوں کو حضرت گنگوہی رح کی طرف سے ملا تھا، یہاں بھی اس کے سوا اور کیا جواب ملتا لیکن دینے والوں نے اسٹیشنوں پہ پہنچ پہنچ کر اتنی رقم حضرت والا کے پاس جمع کردی تھی کہ تار پر بلائے ہوئے لوگوں کے سوا ان لوگوں کے لئے آپ کو محسوس ہوا کہ اس میں گنجائش پیدا ہوسکتی ہے۔ گنجائش کے اسی احساس کا نتیجہ جیسا کہ خاں صاحب کی اسی روایت میں ہے یہ ہوا کہ

"آپ نے (یعنی سیدنا الامام الکبیر نے) اجازت دے دی" (ارواح ص ۲۲۲)

اور میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ خاں صاحب کی اسی روایت کے آخر میں یہ خبر بھی دی گئی ہے، کہ راستہ کی آمدنی

لہ خود قرآن ہی میں حج کا ذکر کرتے ہوئے تزودوا (زاد راہ اپنے لئے مہیا کرلیا کرو) کا حکم دیا گیا ہے، ارباب تفسیر نے متعدد روایتیں اسی قرآنی حکم کے ذیل میں درج کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یمن میں خصوصیت کے ساتھ یہ رواج تھا کہ بلا زادِ راہ کے لوگ حج کرنے کے لئے نکل پڑتے، اور کہتے کہ ہم لوگ توکل والے لوگ ہیں، حالانکہ دراصل بھیک مانگنے کا ذریعہ اپنے حج کو بناتے تھے جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ بخاری کی شرح عینی میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فقرہ بل انتم متاکلون نقل کیا گیا ہے۔ ۱۲

"ان لوگوں کو (یعنی غیر مستطیع لوگوں کو) دے دیتے تھے"

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ ان لوگوں کے مصارف کی ذمہ داری بھی سیدنا الامام الکبیر نے اپنے ذمہ لے لی تھی، صحیح طور پر اگرچہ نہ اسی کا پتہ چلتا ہے کہ آمدنی جو ہوئی تھی، اس کی مقدار کیا تھی، اور نہ ان لوگوں کی واقعی تعداد بتائی جا سکتی ہے جن کے مصارف سفر حضرت والا کی طرف سے ادا کئے گئے۔ لیکن آگے اسی روایت میں میر شاہ خاں مرحوم کی اطلاع کے الفاظ یعنی سیدنا الامام الکبیر سے

"ساتھیوں نے کہا کہ حضرت آپ تو سب ہی دے دیتے ہیں کچھ تو اپنے پاس رکھئے"

تو جواب میں برجستہ مشہور حدیث نبوی

انما انا قاسم واللہ یعطی	میں تو سوائے اس کے کہ بانٹنے والا ہوں اور کچھ نہیں ہوں، دے تو رہا ہے اللہ

کے الفاظ زبان مبارک پر جاری ہوئے یہ عجیب و غریب حدیث آج بھی دارالعلوم دیوبند کی تاریخی یادگاروں، اور نمایاں کاغذات میں بطور "طغرائے امتیاز" یا مونوگرام استعمال ہوتی ہے، اور نبوت ہی کے دوسرے انکشاف یعنی الاسماء تنزل من السماء (یعنی لوگوں کے نام جو رکھے جاتے ہیں، وہ بھی آسمان ہی سے نازل ہوتے ہیں۔) سے اسکی تصدیق ہوتی ہے۔

خیر یہ قصہ تو ایک مستقل قصہ ہے مسلسل عرض کرتا چلا آ رہا ہوں کہ مٹنے پر جو تل جاتا ہے اس کو کس کس رنگ میں بقا بخشی جاتی ہے، اور کہاں کہاں سے کتنا حصہ دیا جاتا ہے، پس سرفرازیوں کی اسی مد میں اس کو بھی شمار کرنا چاہئے اس وقت تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر نے ان لوگوں کو جو اجازت دی تھی، وہ سوچ سمجھ کر دی تھی، آپ کے پاس جو کچھ جمع کرایا گیا تھا، وہ بانٹنے ہی کے لئے جمع کیا گیا تھا۔

اس میں گنجائش جب پائی جاتی تھی، تو ان بے چاروں کو رہ کنے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی، آپ گھر سے لے کر کیا چلے تھے، جو گھر لانے کی (العیاذ باللہ) آپ کو فکر ہوتی۔

پس جن لوگوں میں بانٹنے کے لئے دیا گیا تھا، ان ہی میں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، سب کچھ آپ بانٹتے چلے گئے، بلکہ سچ پوچھئے تو آپ کے ذریعہ سے "توکل صادق[1]" یعنی

ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ	اور جو اللہ پر بھروسہ کرلیتا ہے پس اللہ اس کے لئے کافی ہے۔

کے قرآنی دعوے کا تجربی مشاہدہ دیکھنے والوں کو، اور دیکھنے والوں سے سننے والوں کو جو ہوا، اور ہوتا رہے گا، اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، گھر سے جو کچھ لے کر نہیں چلا تھا، کیا عجیب تماشا ہے کہ بمبئی پہنچنے تک اسی کے پاس اتنا کچھ جمع ہو گیا، کہ خود ہی نہیں بلکہ اپنے ساتھ کتنوں کو حج و زیارت کی سعادت سے شرف اندوز ہونے کا موقعہ اس کی وجہ سے مل گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں جہاز کا کرایہ موجودہ زمانہ کے حساب سے بہت کم تھا۔ مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے، کہ

"چھتری کا محصول، ۵؍ للعہ، اور ٹکٹ کا کرایہ ۲۵؍ عمہ تھا۔" ص۲۳۵

اونٹوں کے کرایہ کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے، کہ جدہ سے مکہ معظمہ دو منزل کی راہ کا کرایہ مولوی صاحب کے بیان کے مطابق،

"شبری کے اونٹ کا کرایہ ۴؍ للعہ تھا اور شغدف کا ۵؍ صہ"

خورد و نوش وغیرہ کی ارزانی کا تخمینہ بھی اسی سے کر لیجئے۔ تاہم تار پر جو بلائے گئے، اور مظفر نگر

---

[1] اپنی حاجات و ضروریات میں حق سبحانہ و تعالیٰ ہی کو وکیل اور کارساز بنا لینا، دراصل یہ ایک قلبی کیفیت ہے، اور اسی کا نام "توکل صادق" ہے جس کی بنیاد ایمانی قوت کے رسوخ اور پختگی پر قائم ہے باقی زبان سے توکل کا لفظ کمزور ایمان والے استعمال کرتے ہیں۔ ۱۲

کے قافلہ کے نام سے بمبئی پہنچے، یا جو "گروہ" زاد سفر کے بغیر حج کے لئے آمادہ ہوا تھا، چاہئے تو یہی کہ ان کی تعداد کافی ہو، یہی نہیں بلکہ مولانا حکیم منصور علی خاں صاحب حیدرآبادی نے اپنی کتاب "مذہب منصور" میں جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"مولانا صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) کے ہمراہ علیگڈھ سے بیت اللہ گیا تھا" ص۱۶۹

قطعی طور پر تو نہیں کہہ سکتا، لیکن حکیم صاحب قبلہ نے اسی کتاب میں جستہ جستہ اپنے جن حالات کا ذکر کیا ہے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے بظاہر خیال یہی ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں وہ علیگڈھ سے بہ نیت حج سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ ہوئے، اس وقت ان کی معاشی حالت اتنے طویل سفر کے مصارف کی شاید متحمل نہیں ہو سکتی تھی، سیدنا الامام الکبیر چونکہ ان پر بہت مہربان تھے، کچھ تعجب نہیں کہ حضرت ہی کے اشارے سے ہمرکابی پر وہ آمادہ ہوئے ہوں۔ ایسی صورت میں سمجھنا چاہئے، کہ علیگڈھ کی اسٹیشن تک اتنی رقم جمع ہو چکی تھی، کہ حکیم صاحب قبلہ بھی حضرت والا کے ساتھ سفر کر سکتے تھے، اور کون جانتا ہے، کہ جیسے علیگڈھ سے حکیم صاحب ساتھ لے لئے گئے تھے، دوسرے اسٹیشنوں پر بھی ایسی صورت پیش نہ آئی ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ بمبئی پہنچنے کے بعد جو تار پر بلائے گئے، اور بلازادوالے جس "گروہ" کو اجازت دی گئی، یا حکیم صاحب قبلہ کی طرح راستہ کے اسٹیشنوں سے جو حضرت والا کے ساتھ ہوئے، وہ تین چار آدمی تو قطعاً نہ ہوں گے، ان سب کو لئے ہوئے وہی جس کی جیب میں گھر سے رخصت ہوتے ہوئے پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی، جہاز میں بھی سوار ہو رہا ہے، اونٹوں پر بھی سب کو سوار کرا رہا ہے، اور بحر و بر کی طویل مسافت، اور اس کے مصارف کو خود برداشت کئے ہوئے ہے۔

ومن یتق اللہ یجعل لہ	اور جو اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کے لئے

مخرجاً ویرزقہ من حیث لا یحتسب	راہ نکال دیتا ہے، اور اسے ایسی طرح رزق پہنچاتا ہے کہ اس کا شان گمان بھی نہیں ہوتا۔

جیسی آیتوں کی حقیقی تفسیر در حقیقت اسی قسم کے واقعات اور مشاہدات ہیں۔

بہرحال بمبئی میں ۲۲ دن کے قیام کے بعد حاجی قاسم کے ٹھیکہ والے جہازی آگبوٹ میں حاجیوں کا یہ قافلہ سوار ہوگیا۔ یہ اتفاق بھی گویا حسن اتفاق ہے۔

بیان کرنے والوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ جہاز پر سوار ہونے والے اس قافلہ میں حالانکہ معقول تعداد ایسے لوگوں کی تھی، جن کے مصارف سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے ادا کئے گئے تھے۔ لیکن جہاز میں پہنچ جانے کے بعد آپ لوگوں میں کچھ اس طرح گھل مل گئے، کہ کسی قسم کے امتیاز کا خطرہ بھی دیکھنے والوں کے دلوں پر گذر نہیں سکتا تھا، کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ جہاز کے ان مسافروں کی بڑی تعداد حضرت والا کے طفیل میں سفر کر رہی ہے۔

کہنے والے ایک قصہ دوشالہ والے صاحب کا بیان کرتے ہیں، جن سے کسی شخص نے عاریتاً چند دنوں کے لئے کسی تقریب کی وجہ سے دوشالہ مانگ لیا تھا، کہتے ہیں کہ بات بات میں اپنے دوشالہ کا وہ ذکر کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ہر واقعہ جو دوشالہ دینے کے بعد پیش آتا، اس کی تاریخ کا حساب دوشالہ دینے کے دن ہی سے کرنے لگے۔ تنگ ظرفی کی جہاں ایسی مثالیں ملتی ہیں، وہیں آپ دیکھ رہے ہیں ظرف کی اس وسعت کو، سب کچھ دیا جا رہا ہے، لیکن اس طریقہ سے دیا جا رہا ہے کہ نہ لینے والوں ہی میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کی امداد سے جا رہے ہیں، اور نہ دوسروں ہی کو اس کے سمجھنے کا موقعہ دیا جاتا ہے

بہرحال حضرت والا کی یہ اخفاء اور لا امتیازی کی شان ہر ہر قدم پر نمایاں رہتی تھی، سیدنا الامام الکبیر باوجودیکہ خلق اللہ کی خدمت علمی افادہ کے ساتھ فرما رہے تھے لیکن

کیا مجال تھی کہ اس میں امتیاز کا کوئی پہلو نمایاں ہو جائے، جیسا کہ ان کے رفیق الدنیاء والآخرت حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی انتظامی شان جا بجا نمایاں نظر آتی تھی، لوگوں کے مال و متاع کی حفاظت ہمراہیوں کی ایک ایک چیز پر نظر ہر ایک کی دیکھ بھال وغیرہ، بقول مولانا عاشق الٰہی صاحب مرحوم

"جہاز کے سارے سفر میں بھی (ان دونوں) حضرات کا فرق طبائع اپنا اپنا رنگ جدا جدا دکھلاتا رہا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اکثر اوقات مجمع میں گھرے رہتے، اور خلق اللہ کو کلمات طیبات سے مستفید فرماتے رہتے تھے۔ مگر حضرت امام ربانی (حضرت گنگوہی) حجاج کی خدمت و راحت رسانی اور تمام رفقاء کے مال و متاع کی محافظت اور انتظام و نگرانی میں مشغول رہتے تھے۔" تذکرۃ الرشید ص ۲۳۶

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے رفیق الدنیا والآخرت حضرت گنگوہی رح نے حضرت والا کے فطری رجحان یعنی سب کچھ ہونے کے باوجود مجھے کچھ نہ سمجھا جائے، اس منشار کی تکمیل کا موقعہ بھی فراہم کر دیا۔ زیادہ سے زیادہ جیسا کہ لوگوں نے بیان کیا ہے، یہ دیکھ کر کہ اتفاقاً اہل علم کا ایک اچھا خاصہ مجمع اس قافلہ میں شریک ہو گیا ہے۔ "انما انا قاسم" کے فرض کو علاوہ مادی قالب کے معنوی شکل میں بھی حضرت والا ادا کرتے رہے

لیکن یہ بھی جو کچھ کیا جاتا تھا، اسی وقت تک اس کا سلسلہ جاری رہتا، جب تک کہ کسی امتیاز کا خطرہ سامنے نہ ہوتا، مگر جوں ہی کہ کسی قسم کی برتری یا امتیاز کا موقعہ آتا، سیدنا الامام الکبیر پیچھے ہٹ جاتے اور قافلہ کا سالار جسے مان لیا گیا تھا (یعنی حضرت گنگوہی رح) اسی کو آگے بڑھا دیا جاتا، یلملم جہاں سے ہندوستان کے حجاج احرام باندھتے ہیں، مولوی عاشق الٰہی نے اسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"یلملم کے قریب جس وقت جہاز پہنچا، اور کپتان نے اطلاع دی کہ "حاجیو! احرام باندھ لو" تو حضرت امام ربانی (مولانا گنگوہیؒ) نے وعظ بیان فرمایا، اور ارکان و ضروریات حج سے لوگوں کو آگاہ کیا۔" ص۲۳۷

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر اپنے جن کلمات طیبات سے لوگوں کو مستفید فرماتے تھے، ان کی نوعیت باضابطہ وعظ اور تقریر کی نہ تھی، بلکہ لوگوں میں ملی جلی بطور عام گفتگو اور بات چیت کے جو کچھ فرمانا ہوتا، فرماتے۔ اور ہمارے مصنف امام مولانا محمد یعقوب صاحب جب تشریف لے آتے، تو علاوہ علمی نکات کے مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے، کہ کچھ تصوّف کے رنگ کی باتیں بھی ہوتیں، ان کے الفاظ یہ ہیں کہ

"حضرت مولانا محمد یعقوب، اور مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہما میں کشوف کونیہ کے اکثر ذکر و تذکرے ہوتے، مکاشفات بیان کئے جاتے، خوابیں ظاہر کی جاتیں۔ غلبۂ ظن پر رائے زنی ہوتی، اور درویشانہ صوفیانہ چھیڑ چھاڑ برابر قائم رہتی تھی۔" ص۲۳۳

زیادہ تر یہ رجحان مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ پر غالب تھا، جس کا اندازہ ان کے حالات سے ہوتا ہے، ارواح طیبہ میں میر شاہ خاں صاحب کے حوالہ سے یہ قصہ ان ہی کے متعلق بیان کیا گیا ہے، کہ خود ہی فرماتے تھے، رات اللہ میاں سے کچھ عرض و معروض کر رہا تھا، لیکن شنوائی نہ ہوتی تھی۔ اصرار جب میری طرف سے زیادہ بڑھا، تو مجھے جھڑک دیا گیا، اور ارشاد ہوا کہ "بس چپ رہو، بکو مت" پھر میں نے توبہ استغفار کیا، اور معافی ہوگئی، لکھا ہے، کہ اس قصہ کو سیدنا الامام الکبیر کے سامنے ایک صاحب دہرانے لگے، تو آپ اُٹھ بیٹھے اور فرمانے لگے،

"اخو مولوی یعقوب نے ایسا کہا، توبہ توبہ توبہ، بھائی یہ انہیں کا کام تھا"

نماز تک [illegible] ہم دیسی گستاخ [illegible] کہتے تھے تو ہماری گردن نیچی

ہوتی۔ ص ۲۳۵ ارواح

بہرحال کچھ ادھر ہم سے [illegible] مسلمانوں [illegible] کا یہ نمازی منظر پورا ابھر رہا تھا،
سب سے زیادہ ولولہ انگیز نظارہ جیسا کہ مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے نماز کے وقت پیش
ہوتا، یعنی جس وقت

"جہاز میں بڑی لمبی صف بندی ہو کر پانچوں نمازیں جماعت سے ادا
ہوا کرتی تھیں"

تو ان ہی کا بیان ہے کہ اور تو اور جہاز کا فرنگی نژاد کپتان

"اس پیاری عبادت کو سیدھے سلیس انداز کے ساتھ ادا ہوتے دیکھتا
تو خوش ہوتا، اور مسلمانوں کی اس عبادت پر تعریف کیا کرتا
تھا" ص ۲۳۶

گویا پانچوں وقت جماعت کی یہ شاندار، پُرشوکت نماز جہاز کے غیر مسلم عناصر کے لئے
اسلامی دعوت کا ایک خاموش قالب تھا۔ کپتان اس درجہ ان لوگوں سے متاثر تھا، کہ
اسی کی خواہش سے جب ایک سرٹیفکٹ حج کرنے والے مسافروں کی طرف سے دیا گیا،
تو لکھا ہے کہ

"کپتان نے اس کو چوما، اور آنکھوں سے لگایا، پھر سر پر رکھ لیا اور
کہا کہ "یہ میرے لئے سند ہے" " ص ۲۳۶

راستہ بھر بجائے کسی قسم کی تحقیر کے دیکھا جاتا تھا کہ آتے جاتے ہوئے راستہ کپتان کو نہ
ملتا، تو لجاجت سے کہتا

"حاجی بابا! ذرا سا راستہ دے دو، ہم نکل جائے" ص ۲۳۵

ماشاءاللہ یہی دین اور مذہب ہے جس کے متعلق مشہور کر دیا گیا ہے، کہ جنگ وجدال

فتنہ و فساد کی وہی جڑ ہے، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں، اس جہاز میں مذہب ہی کس رنگ کو پیدا کر رہا ہے۔ بس سچ وہی ہے کہ خود مذہب یا دین پر تو یہ بہتان ہے۔ البتہ مذہب کے غلط استعمال نے کبھی کبھی اس کے برعکس نتیجہ کو بھی پیدا کیا ہے۔ لیکن ذمہ دار اس کا مذہب نہیں، بلکہ وہ لوگ ہیں، جو مذہب کے صحیح استعمال سے واقف نہیں ہیں، یا قصداً و عمداً اپنے پوشیدہ ذاتی اغراض کیلئے غریب مذہب کو استعمال کرتے رہے یا اس وقت تک کر رہے ہیں، مولوی عاشق الٰہی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان مسلمانوں کی صحیح دینی زندگی کو دیکھ کر

"کپتان بھی حج کو جانے والے مسافروں سے کچھ اس درجہ مانوس ہوا، کہ بلا محصول سویز کی سیر کرانے کی خود اپنی سواریوں سے درخواست کی۔" ص ۲۳

لیکن شکریہ کے ساتھ اس کی درخواست پر عمل کرنے سے معذوری ظاہر کی گئی، بظاہر اس کی وجہ شاید یہی ہو گی کہ کپتان کو اس قسم کے تصرفات کا قانونی استحقاق نہ تھا۔

بہر حال حج کرنے والوں کا یہ قافلہ بقول مولٰنا عاشق الٰہی آٹھ دن میں عدن پہنچا، اور

"ایک دن رات وہاں ٹھیر کر جہاز روانہ ہوا، چوتھے دن جدہ کی بندرگاہ نظر آنے لگی۔"

اور ان ہی کی اطلاع کے مطابق

"سارا قافلہ نہایت آرام اور راحت کے ساتھ تیرھویں دن بمبئی سے چل کر جدہ آ پہنچا۔"

بہر حال جدہ تک تو سیدنا الامام الکبیر اسی حال میں پہنچے، کہ دوسرے آپ کو لئے جا رہے ہیں، اور آپ ان کے ساتھ جا رہے ہیں، عرض کر چکا ہوں کہ لانے کے لئے ناسوتی طور پر

نہ سہی، لیکن ان دیکھی راہ سے مکہ معظمہ میں سیدنا الامام الکبیر کے دو قبلوں میں جو ایک قبلہ تھا، خود وہی پہنچ گیا تھا، مکہ مکرمہ میں بیٹھے بیٹھے یہ اطلاع مولوی افضال الحق کو دی گئی کہ

"مجھے اس وقت جہاز کا مستول نظر آیا"

لیکن جدہ پہنچ جانے کے بعد حالات ہی کچھ ایسے پیدا ہوئے، کہ سیدنا الامام الکبیر بھی اپنے اندرونی جذبات کو دبا نہ سکے۔

یوں تو عام طور پر حج کے مسافروں کے ساتھ یہ صورت پیش آتی ہے، کہ جدہ میں وقت پر سواری کے نہ ملنے کی وجہ سے بلا ضرورت قیام پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ لیکن مولانا عاشق الٰہی صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال علاوہ عام اسباب کے سواریوں کی راہ میں بڑی رکاوٹ خاص وجہ سے بھی پیدا ہو گئی تھی، قصہ تو طویل ہے، حاصل یہ ہے کہ ہندوستان (شہر میرٹھ) کے ایک صاحب مولوی محمد احسن مرحوم نے مکہ معظمہ

ؐ مطوفی کے اس پیشہ کی ابتداء حج کے سلسلہ میں کب سے ہوئی، ایک دلچسپ تاریخی سوال ہے، یوں تو ایسے مقامات جہاں کسی وجہ سے نو وارد مسافروں کی آمد ورفت کا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے، وہاں راہ نمائی کے لئے کچھ لوگوں کا آمادہ ہو جانا ایک قدرتی ضرورت ہے، مکہ معظمہ جہاں ایشیاء و افریقہ کے دور دراز مقامات سے ہر سال ہزار ہا ہزار آدمی آتے جاتے رہتے ہیں، وہاں کوئی ایسا طبقہ جیسا کہ مطوفوں کا ہے، محل تعجب نہیں ہو سکتا۔ لیکن پچھلی چند صدیوں سے مطوفیت کے اس پیشہ نے جو رنگ اختیار کیا ہے، اسے دیکھ دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ خدا کے سب سے زیادہ مقدس و پاک گھر والے شہر میں یہ کیا ہو رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تیرتھ گاہوں میں پنڈوں کی طرف سے جو کچھ کیا جاتا ہے، اسی کا چربہ ان مطوفوں نے اتار لیا ہے، تعجب میں اضافہ اس لئے بھی ہوتا ہے، کہ اسلام تو اسلام مکہ والے جب جاہلیت میں لت پت تھے، اس زمانہ میں بھی باہر سے آنے والوں کی رفادت (مہمان نوازی) وسقایت (پانی پلانے کا انتظام) اپنی طرف سے کرتے تھے۔ بجائے کچھ لینے کے جس سے جس حد تک ممکن تھا حج کے لئے آنے والوں کے ساتھ حسن سلوک ہی کے ساتھ پیش آتا تھا، واللہ اعلم بالصواب اسی قسم کے لوگ جس کی مثال بھی میرٹھ والے مولوی احسن ہیں، انہوں نے ہندوستان سے جا جا کر مطوفی کے اس پیشہ میں ہندوستانی پنڈوں کے رنگ کو بھرا۔ آخر آج کون بتا سکتا ہے کہ مطوفوں کا طبقہ آجکل جو مکہ معظمہ میں پایا جاتا ہے۔ یہ کہاں سے اس شہر میں آیا، اور عربوں میں کچھ اس طرح گھل مل گیا کہ بظاہر وہ اسی ملک کے قدیم باشندے نظر آتے ہیں۔ ۱۲ دیکھو اگلے صفحہ پر۔

پہنچ کر کوشش کی، کہ مطوفی کا حق ان کو بھی دیا جائے، کوشش ان کی کامیاب ہوئی، مطوفی کی باضابطہ سند حکومت سے ان کو مل گئی، ان کی مطوفی کا یہ پہلا سال تھا، حضرت حاجی صاحب قبلہ سے اجازت لے کر مولوی احسن جدّہ اس لئے پہنچ گئے، کہ اس ہندی قافلہ کی مطوفی کا فرض وہی انجام دیں گے، مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے، کہ مولوی احسن ہندی مطوف نے جدّہ کی،

"بندرگاہ پر سارے قافلہ کا استقبال کیا، اور خیر مقدم کہا"

مگر مولوی احسن مطوف کی یہ پیش قدمی اس ہندی قافلہ کے لئے مصیبت بن گئی، ان کے دوسرے ہم پیشہ مطوفین جو پہلے سے اس کاروبار کو انجام دے رہے تھے، ان پر یہ بات شاق گذری، کہ حاجیوں کی اتنی بڑی تعداد اس شخص کو مل گئی، خصوصاً یہ دیکھ کر کہ اس ہندی قافلہ میں ہندوستان کے مستند علماء شریک ہیں، جن کی مطوفی مختلف وجوہ سے فائدہ مند ثابت ہو سکتی تھی، اس سے محرومی ان کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی، اور بقول مولانا عاشق الٰہی صاحب ان پیشہ ور مطوفوں نے

"وہ دراندازیاں کیں کہ تین دن تک مولوی محمد احسن صاحب کو کرایہ کے

بسلسلہ صفحہ ۴۲

ے رفادت وسقایت کی روایات کے ساتھ ساتھ زمانۂ جاہلیت ہی میں اس قسم کی روایتیں بھی ملتی ہیں، جو ہندوستانی پنڈتوں کی طرف منسوب کر کے حضرت مصنف نے نقل کی ہیں۔ بناء ابراہیمی میں تغیر کر کے جب اہل جاہلیت نے کعبہ کو تعمیر کیا تو بجائے دو دروازوں کے صرف ایک ہی در رکھا، اور اسے قد آدم سے بھی اونچا رکھا، تاکہ کوئی بھی ان کی اجازت و اعانت کے بغیر داخل کعبہ نہ ہو سکے، اور اس سے کلید برداران کعبہ کچھ وصول کر سکیں، جیسا کہ احادیث میں اسکی خبر دی گئی ہے، اس سے واضح ہے کہ مکہ میں یہ مجاوری کی روایتیں فی زمانہ ہندوستان کے پنڈوں سے نہیں پہنچیں، بلکہ زمانۂ جاہلیت کا ورثہ ہے جو مکہ ہی میں شروع ہوا تھا، ایسے مقبول اور مرجع خلائق مقامات یا اشخاص کے ماحول میں ایسی باتوں کا پیدا ہو جانا جس سے اہل ہوی اپنی حرص و آز کی تسکین کا سامان بہم پہنچا سکیں امر طبعی ہے محض تقلیدی نہیں ہے۔ ہندوستان کی درگاہوں کا عامۃً بھی نقشہ ہے جو صاحب خانقاہ کے گذر جانے پر قدرتاً بے معرفت اخلاف میں پیدا ہو جاتا ہے۔ فخلف من بعدہم خلف اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشہوات فسوف یلقون غیّا - ۱۲ محمد طیب غفرلہ

اونٹ بھی نصیب نہ ہوتے، یعنی پھر اس قافلہ کو سوار کیا ہی نہ گیا
گویا پرانے مطوفوں نے اونٹ والوں کو بہکا دیا ۔ اور اس سیدی قافلہ کو مکہ معظمہ پہنچانے
پر اسی لئے کوئی راضی نہ ہوتا تھا۔ معاملہ کافی پیچیدہ تھا۔ مولوی احسن صاحب بیچارے راہ مطوفی
کے نوگرفتاروں میں تھے۔ مقابلے میں پرانے پرانے گرگ مطوفوں کا گروہ تھا، نہیں
کہا جا سکتا تھا، کہ اونٹ والوں کی اس اٹک کا یہ تصرف کہاں تک صادر ہوگا، اور دن پر جو گذر
رہی تھی، وہ تو خیر گذر رہی تھی لیکن لے جانے والے جیسے لے جا رہے تھے خود وہ بھی
پہنچنے کے لئے درحقیقت کتنا بے چین تھا، مطوفین کی اس کشمکش میں یہ راز درون سینہ
باہر نکل پڑا۔ مولانا حکیم منصور علی خان حیدرآبادی عرض کر چکا ہوں کہ اس سفر میں سیدنا
الامام الکبیر کے ہمرکاب تھے، اپنی کتاب مذہب منصور میں اس کا تذکرہ فرماتے
ہوئے کہ

"جدہ میں پہنچ کر چند روز قیام کرنا پڑا، سواری نہیں ملی"

اسی سلسلہ میں اپنی چشم دید، گوش شنید شہادت، سیدنا الامام الکبیر کے متعلق یہ درج
فرمائی ہے، کہ

"اس وقت (یعنی جب سواری نہیں مل رہی تھی۔ دن پر دن جدہ میں گذرتے
جا رہے تھے) یہ شعر زبان فیض ترجمان پر جاری تھا ؎

مانگا کریں گے، ہم بھی دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعار کے ساتھ " مذہب منصور ۱۷۹

شاید "وعدہ وصل" کے قرب و نزدیکی نے، دل کی چھپی دبی آگ کو تیز سے تیز تر کر دیا، اتنا
بھڑکا دیا کہ کم از کم اپنے خاص حلقہ میں شعر ہی کے پردے میں سہی، جو کچھ آپ پر گذر رہی
تھی، اسے ظاہر ہی کر دیا، مگر با ایں ہمہ اضطراب والتہاب، یہ سننے کی بات ہے، کہ سواری
کے بندوبست میں جس قسم کی افراتفری پیشہ ور مطوفوں کی باہمی لاگ ڈانٹ کی وجہ سے پیدا

ہوگئی تھی، اسی کا نتیجہ جیسا کہ مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے، یہ ہوا کہ کافی تگ و دو، کھینچ و کاؤ کے بعد مولوی احسن جیسے بھی اونٹوں کے بند و بست کرنے میں تین چار دن بعد کامیاب ہوئے، لیکن بہ یک وقت پھر بھی قافلہ کی روانگی ممکن نہ ہو سکی۔ مجبوراً دو ٹولیوں میں قافلہ منقسم ہوگیا، کچھ لوگ پہلے روانہ کر دیئے گئے، اور جو باقی رہے، وہ ان کے بعد جدہ سے نکلے، قافلہ کی اس تقسیم کی وجہ سے ٹھہرنے کی منزل میں بھی اختلاف پیدا ہوگیا۔ بقول مولوی عاشق الٰہی صاحب

"جو اونٹ اول وقت چل نکلے، انہوں نے بحرہ (نامی منزل) میں اور باقی قافلہ نے حدہ (نامی منزل) میں قیام کیا، اس طرح قافلہ کے دو حصے ہوگئے"

معلوم ہوتا ہے، کہ قافلہ کی یہ دونوں ٹولیاں اسی لئے مکہ معظمہ بھی ایک ساتھ نہ پہنچیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف مولوی عاشق الٰہی صاحب تو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ

"اگلے دن شب کے وقت مکہ معظمہ پہنچے"

لیکن اسی کے مقابلہ میں سیدنا الامام الکبیر کے تلمیذ رشید، رفیق سفر مولانا منصور علی خاں صاحب حیدرآبادی اپنے استاد کے متعلق خبر دیتے ہیں کہ

"قریب صبح صادق کے وہاں داخل ہوئے" [179]

بظاہر دونوں روایتوں میں کچھ تضاد کی کیفیت نظر آتی ہے، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، جدہ میں جب یہ طے ہی ہوگیا کہ ایک ساتھ قافلہ کا روانہ ہونا ممکن نہیں، تو جیسا کہ عام دستور ہے، لوگوں نے جدہ سے نکل جانے کی کوشش کی ہوگی۔ لیکن جس کی ساری زندگی اس دستور عام کے خلاف گذری تھی، وہ یہ کیسے کر سکتا تھا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دوسروں کو نکل جانے کا موقعہ دیا گیا، اسی لئے پہلے جو روانہ ہوئے، وہ رات ہی کو مکہ معظمہ پہنچ گئے، اور بقیہ قافلہ جو بعد کو جدہ سے نکلا، بجائے بحرہ کے حدہ نامی منزل

میں پڑاؤ کرنے کے بعد صبح صادق کے قریب مکہ معظمہ پہنچا، اسی بقیہ قافلہ میں آپ شریک تھے۔ یہ عجب تقدیری کرشمہ ہے کہ واپسی کے وقت بھی مکہ معظمہ سے روانہ ہوکر اسی حدہ نامی منزل میں سیدنا الامام الکبیر کی اس علالت کی ابتدا ہوئی، جو آپ کی آخری علالت بالآخر ثابت ہوئی، اور جاتے ہوئے بھی بجائے بحرہ کے اتفاق ہی کچھ ایسا پیش آیا کہ حدّہ ہی میں آپ کو قیام کرنا پڑا تھا۔

بہرحال بقول مولٰنا عاشق الٰہی صاحب آگے پیچھے قریب قریب ۲۲ ذی قعدہ کو جدّہ سے ہندوستانیوں کا یہ قافلہ مکہ معظمہ جانے کے لئے روانہ ہوگیا، ان ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ بجائے شغدف کے سیدنا الامام الکبیر خود اونٹ پر سوار ہوئے، اور ردیف اس سفر میں اپنے بھائی مولٰنا محمد منیر نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو بنائے ہوئے تھے۔ یعنی پیچھے کمر پکڑ کر ہی بیٹھے تھے، مولٰنا منصور علی خاں صاحب مرحوم بھی ساتھ ساتھ تھے، انہوں نے لکھا ہے،

"مکہ شریف جب قریب آیا غسل فرمایا"

شاید اس غسل کا ارادہ پہلے ہی سے کرلیا گیا تھا، اسی لئے علاوہ عام ضرورتوں کے غسل کے لئے بھی پانی ساتھ رکھ لیا ہوگا، ورنہ عرب کی سرزمین میں "غسل" کا مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے، کہ جہاں جی چاہا، نہانے بیٹھ گئے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے، کہ ۱۲۹۴ھ ہجری ذی قعدہ کا یہ مہینہ ٹھیک نومبر کے مہینے کے مطابق تھا، صبح صادق کا وقت، عرب کا صحرا، باسی پانی اور غسل کی ہمت، وہ بھی سفر کی حالت میں، یہ دلیل ہے کہ اس وقت تک سیدنا الامام الکبیر کی عام صحت جادۂ اعتدال سے منحرف نہیں ہوئی تھی۔

ادھر تو یہ تیاریاں ہو رہی تھیں، اب سنئے دوسری طرف کا حال، یوں تو جدّہ پہنچنے سے پہلے ہی جیسا کہ معلوم ہو چکا کسی نہ کسی رنگ میں اس جہاز تک آپ کے پیرو مرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ پہنچ ہی چکے تھے جس پر لانے والے اپنے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کو

لا رہے تھے، اور اب آئیے دیکھئے، مولنا منصور علی خاں حیدر آبادی راوی ہیں کہ جب قریب صبح صادق حدود مکہ معظمہ میں آپ داخل ہوئے تو

"جناب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب بطور استقبال کے تشریف لائے" ص۱۷۹

جہاز جس وقت ساحل سے ابھی لگا بھی نہ تھا، سطح سمندر ہی پر تیر رہا تھا، اس وقت نادیدہ راہ سے استقبال کے لئے آنے والا کیسے آیا تھا، نہ دوسروں نے اس کو دیکھا تھا، اور نہ اس کی کیفیت وہ بیان کر سکتے تھے، لیکن اب وہی استقبال ناسوتی رنگ میں سب کے سامنے تھا، اس ناسوتی استقبال کا شوق و ذوق کہاں، کس شکل میں پورا ہوا تھا، مولٰنا عاشق الٰہی نے اس کی کچھ تفصیل بھی بیان کی ہے۔ ہم اسی سے اخذ کر کے حسب وعدہ ان تفصیلات کو درج کرتے ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہئے، کہ حضرت حاجی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ یوں تو بقول مولنا تھانوی

"کچھ خلقۃً ضعیف، خفیف اللحم تھے" ص۴۹ کرامات امدادیہ

حساب سے عمر بھی حضرت والا کی اس زمانہ میں ساٹھ سال سے متجاوز ہو چکی تھی، اور بقول حضرت تھانوی

"اس پر مجاہدات و ریاضات و تقلیل طعام و منام"

کے ساتھ ساتھ ۵۷ء کے رست وخیز میں ہندوستان سے عرب تک پہنچنے میں ع

فیوماً بحزوی ویوماً بالعقیق

کے حالات سے آپ کا گذرنا، انتہائی سراسیگی و بے نوائی کی حالت میں کسی نہ کسی طرح مکہ معظمہ تک گو رسائی تو ہو گئی، لیکن اپنی غیور طبیعت کی وجہ سے فاقوں پر فاقوں کی مسلسل مصیبتوں کے جھیلنے کی وجہ سے ضعف و اضمحلال کے جس درجہ تک پہنچ گئے تھے، اس کا اندازہ کچھ آپ

کے حالات ہوا کرتے ہیں۔ ہوتا ہے مگر با ایں ہمہ آنے والوں کے استقبال کا ولولہ آپ کی تمام جسمانی ناتوانیوں پر غالب آیا، ان ہی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"باوجود ضعف و نقاہت کے سنت استقبال اور جوش محبت میں شہر مکہ معظمہ سے باہر ملنے کی خواہش پوری کئے بغیر نہ رہ سکے"

ص ۲۳۷ تذکرۃ الرشید

آپ کو اس کی خبر تو مل گئی تھی، کہ مولوی احسن مطوف جدید نے سواریوں کا بندوبست قافلے کے لئے کر دیا ہے، اور قافلہ جدہ سے چل بھی پڑا ہے۔ لیکن صحیح طور پر اس کا اندازہ مشکل تھا کہ قافلہ ٹھیک کس وقت مکہ معظمہ پہنچے گا۔ احتیاطاً اسی لئے وقت سے بہت پہلے شہر سے نکل کر آپ اس جگہ پہنچ گئے، جہاں قافلہ کے پہنچنے کی امید کی جا سکتی تھی، نہیں کہا جا سکتا کہ اس مقام پر آپ کس وقت پہنچ گئے تھے مولوی عاشق الٰہی کے الفاظ ہیں کہ

"خدا جانے کس وقت سے منتظر کھڑے اور راستہ کی جانب آنے والے قافلہ کا انتظار فرما رہے تھے" ص ۲۳۷

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، قافلہ دو ٹولیوں میں تقسیم ہو گیا تھا، جن میں ایک ٹولی تو مکہ معظمہ پہلے پہنچ گئی تھی۔

"شب کا وقت تھا"

غالباً یہ الفاظ مولوی عاشق الٰہی صاحب نے پہلی ٹولی کے متعلق لکھے ہیں، اور صبح صادق کے وقت وہ ٹولی پہنچی جس میں سیدنا الامام الکبیر شریک تھے مطلب جس کا یہی ہوا کہ تقریباً ساری رات ہی حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی ذوق استقبال کے نذر فرما دی، پہلی ٹولی کے بعد دوسری ٹولی کے پہنچنے کا انتظار کرتے رہے۔

مولوی عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ

"جس وقت قافلہ باب مکہ پر پہنچا، تو سب نے دیکھا کہ اعلیٰحضرت (حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ) پٹکے سے کمر باندھے ہوئے فصیل کے پاس کھڑے تھے۔"

جوں ہی کہ لوگوں کی نظریں حاجی صاحب پر پڑیں (بقول انہیں) کے

"جاں نثار خدام، اسی وقت سواری سے نیچے اتر پڑے، اور بغل گیر ہو ہو کر خوب دل کھول کر ملے۔"

حیرت اس پر ہوتی ہے، کہ اس رتجگے اور شب بیداری کے بعد بھی حضرت حاجی صاحب میں اتنی قوت باقی تھی، جسے ایمانی قوت کے سوا ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں، کہ

"قافلہ کے ایک ایک متنفس سے اجنبی ہو یا واقف کار بغل گیر ہوئے۔"

مولوی عاشق الٰہی کا تخمینہ ہے، کہ اس موقعہ پر تقریبًا ایک سو آدمیوں سے آپ کو بغل گیر ہونا پڑا، ہر ایک کی مزاج پرسی بھی مسکرا مسکرا کر فرماتے جاتے تھے، نئے ہندی مطوف مولوی احسن میرٹھی ان لوگوں کا تعارف کراتے جاتے تھے، جنھیں حضرت حاجی صاحب خود پہچان نہ سکے، لطف یہ تھا کہ ان ہی لوگوں میں جو حضرت حاجی صاحب سے بغل گیر ہو رہے تھے، بعض ایسے حضرات بھی تھے، جو بے چارے حاجی صاحب کی جسمانی ناتوانیوں کی پروا کئے بغیر دیر تک معانقہ کے سلسلہ کو دراز کرتے چلے جاتے تھے۔ لیکن آج حاجی صاحب پر جو رنگ تھا، قلبی مسرت کی کیفیت قالب کے ضعف پر غالب آگئی۔ مولوی عاشق الٰہی صاحب نے اسی قسم کے لوگوں کے متعلق لکھا ہے کہ

"جب تک وہی (یعنی بغل گیر ہونے والا) علیحدہ نہ ہوگیا۔ اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب) نے اپنے سینۂ علم و معرفت گنجینہ سے علیحدہ نہ کیا۔" ۱۳۳۵ھ

صبح ہو ہی رہی تھی، نماز کے بعد باب مکہ سے قافلہ بلد اللہ الامین کی طرف روانہ ہوا، عام دستور کے مطابق خیال یہی تھا کہ ان نووارد مسافروں کے قیام و طعام وغیرہ ضرورتوں کا نظم مطوف صاحب نے کیا ہوگا، لیکن قدرت اپنے ایک نئے کرشمہ کا تجربہ کرانا چاہتی تھی، یاد ہوگا' آج سے تقریباً بیس سال پہلے تھانہ بھون کی جہادی مہم میں جہاں اور سب کچھ دیکھا گیا تھا' اسی سلسلہ میں ایک جگر خراش دردناک منظر وہ بھی تھا' کہ امیر بیعت جہاد اور اس کے دو مخلص ترین خادم یعنی خود حضرت حاجی صاحب ' حضرت مولٰنا گنگوہی اور سیدنا الامام الکبیر ایک دوسرے سے بچھڑے تھے' اور اس طور پر بچھڑے تھے' کہ پھانسی کے تختے اور تانت کے پھندوں کے سوا شاید ان کے سامنے اور کچھ نہ تھا' حضرت مولٰنا گنگوہی کی پھانسی پر جانے کی خبر جیسا کہ عرض کرچکا ہوں، پھیل بھی چکی تھی۔ الغرض ایک تیرہ و تار مہیب مستقبل تھا' جو ہر ایک کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ پھر جو کچھ گذرنے والا تھا' گذرتا رہا' تاآینکہ آج پھر ان ہی تینوں بچھڑنے والوں کو "باب مکہ" یعنی مکہ کے دروازہ پر بلانے والا بلاتا ہے' اور کس شان کے ساتھ بلاتا ہے' حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو اسی مکہ مکرمہ تک بے سروسامانی کی حالت میں پہنچے تھے' ان کی طرف سے یہ اطلاع دی جاتی ہے' کہ آپ دونوں حضرات' اور آپ کے ساتھ جتنے ہیں' سب اس رباط کہئے' یا مکان میں ٹھیرائے جائیں گے' جو مکہ معظمہ کے محلہ حارۃ الباب میں حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں کسی نیازمند کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔[۵۱] مولوی

[۵۱] کرامات و کمالات امدادیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں کافی دشواریوں سے حاجی صاحب کو مکہ معظمہ میں دوچار ہونا پڑا۔ لکھا ہے کہ فقر و فاقہ کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ نو روز تک بجز آب زمزم کے (باقی اگلے صفحہ پر)

عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے، کہ

"یہ مکان اسی سال ملا تھا، بلکہ ابھی تک آپ نے اس میں سکونت مستقل نہ فرمائی تھی۔"

یہ وہی مکان تھا، جس کے متعلق کرامات امدادیہ میں حضرت تھانوی رحمہ نے یہ روایت درج کی ہے، کہ

"ایک مخلص نے ایک مستقل مکان حارۃ الباب میں خرید کر کے حضرت ایشان (یعنی حاجی صاحب) کے نذر کیا تھا" ص۳۲ کرامات امدادیہ

اور گو حارۃ الباب مکہ معظمہ کا ایک ایسا محلّہ تھا، جس میں سب سے زیادہ تکلیف پانی کی تھی، کرامات امدادیہ ہی میں ہے کہ موسم حج ہی میں نہیں، عام زمانہ میں بھی "انتہائی درجہ ایک روپیہ میں دو مشک آتی تھی۔"

(بسلسلۂ صفحۂ گذشتہ) کچھ نہ ملا۔ لیکن تقویٰ کی زندگی کے آثار جب اسی مکہ میں سامنے آنے لگے، تو دیکھا گیا کہ ایک ایک وقت میں پانچ پانچ ہزار تک کی رقم پیش کرنے والے پیش کر رہے ہیں، اور حاجی صاحب اہل استحقاق پر ان کو بکشادہ پیشانی تقسیم فرماتے جاتے ہیں۔ آخر میں تو ایک طرف حکومت ترکیہ سے تحریک ہوئی، کہ حاجی صاحب جن کا نسلی تعلق حضرت ابراہیم بن ادھم سے تھا، ان کے مزار مبارک کے اوقاف جو شام میں تھے، ان اوقاف کا متولی آپ کو بنا دیا جائے اس وقف کی خصوصیت یہ تھی، کہ متولی کو ہر قسم کے تصرفات کا اختیار اس کی آمدنی میں وقف کرنے والے کی طرف سے دیا گیا تھا، حکومت کی طرف سے یہ بھی ظاہر کر دیا گیا تھا کہ وقف کے انتظام کے لئے حاجی صاحب کو شام جانے کی ضرورت نہ ہوگی، ان کا نائب وہاں سب کچھ کرے گا لیکن آپ نے شکریہ کے ساتھ ترکی حکومت کی اس پیش کش کو یہ فرماتے ہوئے نامنظور کیا کہ حضرت سلطان ابراہیم نے تو سلطنت کو لات ماری تھی، پھر میں ان کی صالح اولاد کیسے ہوں گا، اگر دنیا کے ان بکھیڑوں کو اختیار کروں، دوسری طرف حکومت حیدر آباد نے بھی لکھا کہ مکہ معظمہ میں دو سرکاری رباطوں میں سے ایک رباط کی کنجی حاجی صاحب کے حوالہ کر دی جائے۔ لیکن اس عنایت سے بھی مستفید ہونے کا موقعہ آپ کو نہ ملا' یہ اور اسی قسم کے واقعات کا ذخیرہ کرامات امدادیہ و کمالاتِ امدادیہ میں جمع کر دیا گیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے۔ ۱۲

مگر جوں ہی کہ یہ مکان اس محلہ میں حاجی صاحب کے سپرد ہوا، نہر زبیدہ کی ترمیم جدید کا سوال اٹھا، ترمیم ہوئی، اس نئی ترمیم کی بدولت پانی کا راستہ کچھ اس طریقہ سے بنا کہ یہ مکان جہاں پر واقع تھا، اس کے

"کوچہ میں اور (مکان خاص کے) دروازہ پر چشمہ کا پانی جاری ہوگیا"

وسعت کا اس کے اندازہ اسی سے کیجئے، یہ سارا قافلہ (بجز چند لوگوں کے) بقول مولانا عاشق الہٰی صاحب

"اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ رح) کی اسی رباط میں مقیم رہا" ص۲۳۵

اللہ اللہ جن کے سامنے پھانسی کے تختہ کے سوا اور کچھ نہ رہا تھا، آپ دیکھ رہے ہیں، اللہ کے گھر میں آج وہی تینوں کس طریقہ سے داخل ہو رہے ہیں۔

ان کو اپنے گھروں میں بھی واپس ہونے کی آج سے بیس سال پہلے امید نہ تھی، لیکن جہاں ان کا گھر نہ تھا، وہیں ان کو گھر دلایا جاتا ہے، راحت و آرام کے ساز و سامان سے جو لیس ہے، اور وہی حاجی صاحب جو اسی مکہ میں جب داخل ہوئے تھے، تو خود ان کے کھانے کا بھی کوئی نظم نہ تھا، آج اپنے ان ہی دو جاں نثار عزیزوں یا روحانی فرزندوں سے فرمارہے ہیں کہ

"میری خوشی اسی میں ہے کہ سب احباب میرے یہاں کھانا کھاویں"

تذکرۃ الرشید ص۲۳ ج ۱۔

حضرت گنگوہی رح فرماتے بھی ہیں کہ

"آدمی بہت ہیں"

لیکن اس کی کوئی پروا نہ کی گئی، باب مکہ سے جب حارۃ الباب کے اس رباط عظیم میں لوگ پہنچے تو کھانا تیار تھا، اس وقت کا کھانا سارے قافلہ والوں کو حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کی طرف سے کھلایا گیا، اسی مکان کے متعلق مولانا حکیم منصور علی خان

یہ بتاتے ہوئے کہ "دو منزلہ تھا" اور یہ کہ اتنا

"وسیع تھا کہ سب ہمراہی اس میں جا بجا ٹھہر گئے"

اور مکان کا وہ خاص حصہ جو مکہ اور مدینہ کے مکانوں میں گویا شہ نشیں ہونے کی حیثیت رکھتا ہے، یعنی صدر دروازہ کے بالاخانہ کی جو عمارت ہوتی ہے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکیم صاحب قبلہ نے لکھا ہے کہ

"دروازے کے اوپر کے مکان پر مولانا صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیرؒ) اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے قیام کیا" ص ۱۰۹

گو حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رونق افروزی سے یہ جدید حاصل شدہ مکان مشرف نہیں ہوا تھا، لیکن رہن سہن میں حضرت حاجی صاحب قبلہ کا جو فطری مذاق تھا حضرت تھانویؒ نے جس کا ذکر کرتے ہوئے کمالات امدادیہ میں ارقام فرمایا ہے، کہ

"حضرت (حاجی صاحب) کے مزاج میں لطافت و نفاست نہایت درجہ تھی۔ اور بہت صاف اور ستھرے رہتے تھے" صفحہ ۳۰

کمالات امدادیہ

اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے خیال تو یہی گذرتا ہے کہ عربی تہذیب و سلیقہ کا نمونہ مہمان خانے کے یہ بالائی کمرے بنے ہوئے ہوں گے۔

بہر حال ذرا سوچئے تو سہی، کہ تھانہ بھون کی جہادی مہم میں باہم ایک دوسرے سے یہ تینوں بچھڑنے والے پہلی دفعہ مکہ معظمہ کے اس ایوان عالی میں جس وقت جمع ہوئے ہوں گے، ان کے قلوب کی کیا کیفیت ہوگی، کہا جائے تو کہا جا سکتا ہے، کہ

للذین احسنوا فی ھذہ الدنیا حسنۃ وارض اللہ واسعۃ انما یوفی الصابرون اجرھم	جن لوگوں نے نیکی کی اس دنیا میں اُن کے لئے نیک بدلہ ہے۔ اور خدا کی زمین وسیع ہے۔ صابروں کو پورا ہی بدلہ دیا جاوے گا،

بغیر حساب (الزمر) | بغیر حساب کے

جیسی قرآنی آیتیں جیتی جاگتی شکلوں میں ان کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں، اور ان کی مجاہدانہ مساعی کا پاکیزہ صلہ دنیا میں بھی ان کے سامنے تھا۔ جس کی طرف آیۃ کریمہ اشارہ کر رہی ہے۔ بلکہ ہم جب سوچتے ہیں کہ یہی حج سیدنا الامام الکبیر کا آخری وداعی حج تھا۔ اور ٹھیک اسی سال مکہ معظمہ کا یہ ایوان عالی حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کیا گیا، اسی مختصر زمانہ میں مکہ جیسے شہر میں نہر زبیدہ کھینچ کر اس مکان کے دروازے پر اس طریقہ سے پہنچا دی گئی، کہ حارۃ الباب کا وہی محلہ جہاں بقول حضرت تھانوی رح

"آب شیریں حکم چشمۂ آب حیات رکھتا تھا" ص۳۲ کرامات امدادیہ

وہیں کے گلی کوچوں میں نہر کا پانی دوڑتا پھرتا تھا اور اسی مکان کے دروازے پر نہر کا ایک چشمہ ابل رہا تھا، کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کس کیلئے تھا، اور کسے اپنے احسانی اعمال کے نتائج کا تجربہ کرانا مقصود تھا۔ بغیر حساب و شمار کے جس صبر کا اجر سامنے آنے والا تھا، کیا اسی کی ہلکی سی جھلک تھی جو بلد اللہ الحرام میں دکھائی جا رہی تھی۔

مکہ معظمہ کے اس مکان میں اتر جانے کے بعد نشاط و انبساط کی جن کیفیتوں سے ان بزرگوں کے منور قلوب معمور تھے، اس کا اندازہ حکیم منصور علی خاں حیدر آبادی کی اس روایت سے بھی ہوتا ہے

انہوں نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہ دروازے کے اوپر کے بالاخانہ پر ٹھیرا دینے کے بعد حضرتِ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ دستور تھا، کہ اپنے دونوں عزیز مہمانوں سے ملنے کے لئے کبھی کبھی خود اوپر تشریف لے جایا کرتے، جوں ہی حاجی صاحب پر دونوں کی نظر پڑتی،

"کھڑے ہو کر تعظیم دیا کرتے تھے، اور نہایت مؤدب دوزانو ہو کر ان کے روبرو بیٹھ جاتے"

لکھا ہے، کہ اسی سلسلہ میں ایک دن ایک دل چسپ لطیفہ پیش آیا، کمرے میں سیدنا الامام الکبیر اس وقت موجود نہ تھے، صرف حضرت مولنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما تھے، اور حکیم صاحب ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں ڈھول بجنے کی آواز مکان کے نیچے سے آنے لگی، اور اسی کے ساتھ آہٹ محسوس ہوئی کہ سیڑھیوں سے اوپر کی طرف کوئی آ رہا ہے، مولنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی نشست جہاں پر تھی، وہ ایسی جگہ تھی کہ سیڑھیوں سے آنے والے آدمی پر ان کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی، صرف آہٹ سن کر ان کو خیال گذرا کہ غالباً سیدنا الامام الکبیر مولنا محمد قاسم نیچے سے اوپر آ رہے ہیں۔ خدا جانے اس وقت حضرت گنگوہی پر انبساط کی کیسی کیفیت طاری تھی، کہ اپنے مزاج اور افتاد طبع کے برخلاف ڈھول کی آواز کے ساتھ حضرت نانوتوی کے آنے کی آہٹ کا خیال کر کے فرمانے لگے، کہ

"اپنے یاروں کو بھی ساتھ لائے"

گویا سیدنا الامام الکبیر کے صوفیانہ رجحان پر ایک تفریحی تعریض تھی۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ آنے والے صاحب جن کے آنے کی آہٹ محسوس ہوئی تھی، یہ سیدنا الامام الکبیر نہیں، بلکہ خود حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، اور نیچے ڈھول بجانے والے فقراء تھے، جو دف بجا بجا کر عرب کے دستور کے مطابق کچھ مانگ رہے تھے بہرحال جوں ہی کہ مولنا گنگوہی کی زبان مبارک سے یہ فقرہ یعنی "اپنے یاروں کو بھی ساتھ لائے" نکلا، کہ حاجی صاحب ان کی پشت پر کھڑے ہوئے جواب دے رہے تھے کہ "یہ سائل ہیں" یہ سننا تھا کہ مولنا گنگوہی گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے، اور

"حضرت حاجی صاحب کے روبرو مؤدب بیٹھ گئے"

بات آئی گئی ہوئی، حکیم صاحب نے اطلاع دی ہے، کہ

"میں نے یہ واقعہ مولنا مرحوم (سیدنا الامام الکبیر) سے عرض کیا"

یعنی آج آپ کی چشتیت پر مولٰنا گنگوہی نے یہ فقرہ چست فرمایا تھا' جو ظاہر ہے ایک تفریحی مذاق کے سوا اور کچھ نہ تھا لکھا ہے "کہ یہ سن کر سیدنا الامام الکبیر صرف

"مسکرانے لگے" ص۱۸۰

اور کچھ نہ فرمایا۔

اور یہ تو خیر ایک لطیفہ تھا' حکیم صاحب ہی نے اسی سلسلہ میں یہ جو ارقام فرمایا ہے' کہ

"دونوں صاحبوں میں کبھی کبھی خوش طبعی اور مذاق ہوا کرتا تھا" ص۱۸۰

اس سے تو بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مکہ مکرمہ کے قیام کا یہ زمانہ کافی مسرتوں اور اور سرمستیوں میں گذر رہا تھا۔ سیدنا الامام الکبیر پر تو تعجب نہیں ہوتا کہ طیبات و ظرافت آپ کی فطرت کا ایک نمایاں پہلو تھا' جس کی تفصیل گذر بھی چکی ہے' لیکن تعجب تو حضرت گنگوہی پر ہوتا ہے جو جبلّۃً جبلِ وقار کوہِ سکینت تھے' زندگی کے تمام شعبوں میں ان کا یہی حال تھا' ہمارے مصنف امام ان کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کبھی کبھی فرماتے' کہ

"میاں حضرت مولٰنا رشید احمد کی عالی ظرفی کا کیا ٹھکانا ہے' سب کچھ پئے بیٹھے ہیں' مگر کیا ممکن کہ ذرہ برابر ظاہر ہو جائے"

(تذکرۃ الرشید ص۲۳۳ ج ۱)

مولوی عاشق الٰہی نے اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے' کہ "ہر وقت مغموم و محزون نظر آتے تھے' ان ہی کا بیان ہے' کہ اتفاقاً مجلس مبارک میں طیبت و مزاح کی کوئی گفتگو چھڑ بھی جاتی' اور

"جن باتوں پر سننے والوں کے پیٹ میں بل پڑتے' درد ہونے لگتا"

تو اس وقت بھی ان ہی کا بیان ہے کہ

"آپ پر ہلکی سی مسکراہٹ سے زیادہ، اور وہ بھی کبھی کبھی مطلق اثر نمایاں نہ ہوتا" ص۲ ج ۲ تذکرۃ الرشید

لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ مکہ معظمہ کے قیام سے ان دنوں میں حضرت گنگوہی ہی کی طرف سے خوش طبعیوں کی ابتدا بھی ہوتی ہے، مذاق اور مزاح کی باتیں بھی ہو رہی ہیں، اور مولوی عاشق الٰہی مرحوم کی یہ روایت، یعنی اپنے حج کے اس سفر میں حج و زیارت سے فارغ ہونے کے بعد "حارۃ الباب" کے اسی رباط میں مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد جب یہ دونوں حضرات آکر مقیم ہوئے، رفقاء سفر واپسی وطن کے لئے بیقرار تھے، لیکن لکھا ہے کہ حضرت گنگوہی فرما دیا کرتے کہ

"جس کو عجلت ہو، وہ چلا جائے" ص۲۴۱

حالانکہ ہندوستان سے ہجرت کا خیال آپ کے دل میں شاید کبھی پیدا نہیں ہوا، گذر چکا کہ بہ نیت ہجرت مولانا رفیع الدین صاحب سابق مہتمم دار العلوم نے مدینہ منورہ ہی میں اقامت گزین ہو جانے کا ارادہ جب فرمایا، تو ان ہی حضرات کے اصرار سے ان کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا، اور ہندوستان واپس ہوئے، لیکن باوجود اس کے آپ دیکھ رہے ہیں، کہ اپنے اس سفر میں جس قسم کی زندگی ان بزرگوں کو میسر آئی تھی، چاہتے تھے، کہ دراز ہی ہوتی چلی جائے۔

ہندوستان میں یہ تینوں بزرگ یعنی پیر و مرشد حضرت حاجی صاحب اور ان کے دونوں عزیز خلفا، جس حال میں ایک دوسرے سے الگ ہوئے تھے، کیا جانتے تھے کہ پھر اسی زندگی میں اور وہ بھی اس راحت و آرام کے ساتھ تینوں کو خدا کے عزیز ترین اور محبوب ترین شہر بلد اللہ الامین میں اس طریقہ سے جمع ہونے کا موقعہ ملے گا، مولانا حکیم منصور علی خاں صاحب نے لکھا ہے، کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ عموماً تشریف

لاتے، اور تصوف کے عام مسائل کے سوا مسئلہ

"وحدت الوجود پر تقریر فرماتے"

اکثریت اس قافلہ میں مولویوں ہی کی تھی، ان کے سامنے اور وحدت الوجود جیسے مُوحِش مسئلہ پر تقریر ایک خاص رنگ پیدا کرتی، حکیم صاحب کا بیان ہے، کہ

"جناب مولوی محمد مظہر صاحب (نانوتوی صدر مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور) اس تقریر پر شبہات پیش کرتے، ان کا جواب بھی حاجی صاحب نہایت متانت اور آسان طریق پر ادا کرتے"

لیکن تقریر کا واقعی روئے سخن جن کی طرف تھا، یعنی مسئلہ وحدت الوجود کی ان تقریروں کے متعلق ان کا حال کیا تھا، حکیم صاحب نے لکھا ہے، کہ

"مولٰنا مرحوم (سیدنا الامام الکبیر) کبھی کوئی شبہ بھی بیان نہ کرتے، اسی طرح مولٰنا رشید احمد صاحب بھی خاموش بیٹھے سنا کرتے، اور کچھ چون و چرا نہ کرتے" ص۱۸۰

کچھ بھی ہو، ان ہی تینوں پر تقریباً بیس سال پہلے جو وقت گذرا تھا، اپنے وطن (ہندوستان) میں گویا بے وطن بنائے گئے، لیکن ان ہی کو بیس سال بعد غریب الوطنی کی زندگی میں آج جس حال میں دیکھا جا رہا ہے، اور جس مقام میں دیکھا جا رہا ہے، یعنی مکہ مکرمہ کے اسی تاریخی سرزمین پر ایک اور واقعہ گذرا تھا، جن کے یہ تینوں غلام تھے، ان ہی غلاموں کے آقا اور پیشوا پر مکہ کی یہی زمین تنگ کی گئی تھی، اس وقت بھی دیکھا گیا تھا کہ بیس سال گذرنے کے بعد یہی تنگ زمین آقا کے لئے کشادہ کی گئی، اور کیسی کشادگی؟ کہ جو رقبہ مکہ کے حدود میں تھا، وہ تو خیر مکہ ہی کے حدود میں تھا، لیکن زمین کے کرے کا وہ سارا علاقہ جو مکہ کے حدود سے باہر تھا وہ بھی اسی کے حدود میں داخل ہوگیا، اور آج تک داخل ہے۔ رہتی دنیا تک انشاء اللہ تعالیٰ داخل رہے گا۔ القریٰ اور روئے زمین کی آبادیاں

اپنی ام کہئے، یاماں کی گود میں جو ڈال دی گئی تھیں، وہ اسی کی آغوش میں قیامت تک پڑی رہیں گی، اب کوئی ان کو اپنی ماں سے جدا نہیں کر سکتا۔[ل]

خیر اس وقت جو کچھ ہوا، اس سے تو دنیا واقف ہے۔ لیکن اپنی "اصل" کا "ظل" اور "ہلکا عکس" اپنے آقا کے ان تین غلاموں میں کوئی دیکھنا چاہے، تو دیکھ سکتا ہے، تنگی کے بعد ان کے آگے بھی فراخی لائی گئی، اور کیسی فراخی! حاجی صاحب جس وقت مکہ معظمہ پہنچے تھے تنہا پہنچے تھے۔ مگر حارۃ الباب کی اسی رباط سے اپنے ان عزیز روحانی فرزندوں کو آستانۂ نبوت کبریٰ کی زیارت کے لئے رخصت کر رہے تھے، تو اس وقت مکہ ہی نہیں، بلکہ مکہ کے باہر رہنے والے وحشی بدو اور بدوؤں کے بعض سر برآوردہ شیوخ تک آپ کی حلقہ بگوشی اختیار کر چکے تھے، جن میں ایک مشہور شیخ نفاع نامی بھی تھے، کرامات امدادیہ میں حضرت تھانوی رح نے نقل کیا ہے کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نفاع کا ذکر کر کے فرمایا کرتے تھے کہ

"اس کو (نفاع بدوؤں کے شیخ کو) مجھ سے عقیدت و محبت تھی"

ل اس مسئلہ کی طرف استقبال قبلہ کے مسئلہ کے سلسلہ میں بھی کچھ اشارہ کیا جا چکا ہے، کعبہ کو قبلہ قرار دے کر سارے روئے زمین کو اس کا صحن بنا دیا گیا ہے، جس کی طرف مشہور حدیث جعلت لی الارض مسجدا (ساری زمین میرے لئے مسجد بنا دی گئی) اسی میں اشارہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ سورہ بقرہ (پارہ سیقول) کے ابتدائی رکوع میں مسلمانوں کو مشرق و مغرب کے درمیان کی مرکزی امت وسط قرار دیتے ہوئے ان کے قبلہ کو مرکزی قبلہ، ان کے نبی کو مرکزی نبی، ان کی کتاب کو مرکزی کتاب ٹھیراتے ہوئے، مختلف پیرایوں میں چند بار دہرا دہرا کر جو اس حکم کا اعادہ کیا گیا ہے، کہ شطر المسجد الحرام کی طرف اپنا رخ کرو، اور جہاں مسلمان مقیم ہوں فرمایا گیا ہے، کہ وہیں سے اپنے رخ کو نمازوں میں اسی مرکزی مسجد کی طرف کر لیا کریں، سب کا حاصل وہی ہے کہ جو کچھ مکہ کے حدود میں پہلے تھا، وہ تو تھا ہی لیکن اب ان علاقوں کو بھی جو مکہ کے باہر سمجھے جاتے تھے اسی قبلہ کے حدود میں سب کو داخل کر دیا گیا ہے، اسی کا اعلان قرآن میں کیا گیا، اور اسی اعلان کے مطابق مسلمان مشرق و مغرب کے آخری گوشوں میں پھیلتے چلے گئے جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، اور آئندہ بھی انشاء اللہ تا بقیام قیامت جاری رہے گا۔ ۱۲

بعض تجربات اس کو ہوئے تھے، جن کی وجہ سے حالت اسی نفاع کی یہ ہوگئی تھی، حاجی صاحب ہی فرماتے تھے، کہ ان کی

"کبھی دست بوسی کرتا کبھی پابوسی" ص۴۳

اسی کا نتیجہ جیسا کہ ہونا چاہیئے تھا، یہ تھا، یہ بھی حاجی صاحب ہی کا بیان ہے، کہ

"جب مدینہ منورہ کو قافلہ جاتا تھا، اول میرے احباب کو لیتا تھا، بعد کو وہ دوسرے مسافروں کا متلاشی ہوتا تھا" ص۴۳ کرامات امدادیہ

ظاہر ہے، کہ احباب ہی نہیں بلکہ "ایشان بجائے من و من بجائے ایشان" کے خطاب سے سرفراز ہونے والے حاجی صاحب کے روحانی فرزندوں کی مدینہ منورہ کی طرف روانگی کا مسئلہ جب پیش آیا ہوگا، تو جو سہولتیں میسر آئی ہوں گی، ان کو آنا ہی چاہیئے تھا، گویا سمجھنا چاہیئے، کہ مکہ سے مدینہ تک اپنی ہی سواریوں پر یہ حضرات روانہ ہوئے ہوں گے، مولانا عاشق الٰہی مرحوم نے لکھا ہے کہ

"بعد حج سلطانی راستہ سے مدینۃ الرسول روانہ ہوئے" ص۲۳۹

اسی سلطانی راستہ پر مدینہ منورہ کے پاس وہ مقام آتا ہے، جہاں سے "قبۂ خضرا" کی دید کے تمنائیوں کی، آرزو کی تکمیل کا آغاز شروع ہو جاتا ہے، عام طور پر جبل مضرج کے نام سے موسوم ہے، مولانا حکیم منصور علی خاں صاحب حیدرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے، کہ

"جب منزل بمنزل، مدینہ شریف کے قریب ہمارا قافلہ پہنچا، جہاں سے روضۂ پاک، جناب لولاک نظر آتا تھا"

لہ بدوؤں ہی کے کسی دوسرے شیخ سے نفاع کی جنگ ہوئی تھی۔ جس میں بندوق کی گولی اس کی ٹانگ میں پیوست ہوگئی تھی، جو کسی طرح باہر نہیں ہوتی تھی، خواب میں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس نے دیکھا کہ اس کے پاؤں کو دبا رہے ہیں، اور گولی کو باہر نکال کر پھینکدیا۔ صبح کو گولی خود بخود باہر نکل گئی ۱۲

تو پھر کیا ہوا، گردنیں جھکا دی جاتی ہیں، لوگ ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں،

واعظم مایکون الشوق یوماً
اذا دنت الخیام من الخیام

یہ تو خیر اسی مقام تک پہنچنے والوں کے عام آثار ہیں۔ حکیم صاحب کا بیان ہے کہ

"فوراً جناب مولانا مرحوم نے اپنے نعلین اتار کر بغل میں دبالیں، اور پابرہنہ چلنا شروع کیا"

شاید ان کی کتاب کے اس فقرے کو کسی دوسرے موقعہ پر بھی نقل کر چکا ہوں، اسی سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس مقام پر پہنچنے سے پہلے سیدنا الامام الکبیر اونٹ سے اتر کر نعلیں پہنے ہوئے پیادہ پا ہی چل رہے تھے، لیکن "قبۂ خضرا" کے روبرو ہو جانے کے بعد کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ نعلین کے ساتھ آگے بڑھنے کا یارا نہ رہا، اور ننگے پاؤں چلنے لگے، یاد ہوگا، کہ راستہ اول سے آخر تک پتھر کے نوکیلے ٹکڑوں سے بھرا ہوا تھا، حکیم صاحب بے چارے جنہوں نے اپنے استاذ کی تقلید میں اپنے پاؤں کی جوتیاں اتار لی تھیں، چند ہی قدموں کے بعد خود لکھا ہے، کہ چلنے سے اپنے آپ کو معذور پانے لگے دوبارہ پہن لینے پر ان کو مجبور ہونا پڑا، لیکن بقول ان ہی کے "جو از فرق تا بقدم نہایت نازک و نرم اندام تھے" ان ہی کو دیکھتے رہے، جیسا کہ خود ہی ارقام فرماتے ہیں کہ

"مولانا مرحوم مدینہ منورہ تک کئی میل آخر شب تاریک میں اسی طرح چل کر پابرہنہ پہنچ گئے" ص ۱۸۱

حکیم صاحب قبلہ کے اس بیان کو اور اسی کے متعلق دوسری تفصیلات جن کا اپنی کتاب "مذہب منصور" میں انہوں نے تذکرہ کیا ہے، پڑھئے، جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کی وارفتگیوں کی تفصیل کے سلسلہ میں حکیم صاحب کی ان چشم دید شہادتوں کو چونکہ نقل کر چکا ہوں، اس لئے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں، مولوی عاشق الٰہی کے

بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ رات ہو جانے کی وجہ سے مدینۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دروازہ کھل نہ سکا۔

"اس لئے قافلہ کو مناخہ (اونٹوں کے اترنے کی جگہ بیرون شہر جو ہے، اسی) میں ٹھیرنا پڑا" ص۲۳۹

صبح ہونے کے ساتھ ہی شہر کا دروازہ کھول دیا گیا، حسب روایت مولانا عاشق الٰہی

"علی الصباح حضرت امام ربانی (مولانا گنگوہی رح) مع دیگر حضرات صلوٰۃ صبح ادا کرنے کے لئے قافلہ سے باہر نکلے، اور مسجد نبوی کی جانب روانہ ہوئے۔ نماز سے فارغ ہو کر روضۂ اطہر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہوئے، اور بڑے جوش و شوق کے ساتھ صلوٰۃ و سلام عرض کیا"

ان ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ صلوٰۃ و سلام کے بعد مواجہہ شریف میں بیٹھ کر مراقبہ بھی کیا گیا، تا اینکہ آفتاب نکل آیا۔ لیکن بقول حکیم صاحب قبلہ جس کا حال یہ ہو، کہ

"اسم گرامی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سن کر لرزہ بدن پر پڑ جاتا تھا، اور چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا" ص۱۸۱

نام ہی کے ساتھ جس کے قلب کے سوز و گداز کا یہ حال ہو، سوچا جا سکتا ہے، کہ اسی پرح

ہم تمہارے سامنے ہوں تم ہمارے سامنے

کا منظر جس وقت پیش آجائے، تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس پر کیا گذری ہوگی؟

سامنے بیٹھے ہوں وہ کس طرح لاؤں اسکی تاب
جس سے دل ڈرتا تھا یارب وہ مقام آہی گیا

حکیم صاحب بے چارے حالانکہ بیان کرنا چاہتے ہیں، یہ خبر دیتے ہوئے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کے ساتھ ہی

"ایک عجیب حالت نمایاں ہو جاتی تھی، جو معرض بیان میں نہیں آسکتی"

بیان کرنے کا ارادہ کرنے کے باوجود حکیم صاحب جیسے بزرگ بیان سے اپنے آپ کو جب عاجز و معذور قرار دے رہے ہوں، تو بے چارے مولوی عاشق الٰہی مرحوم جنھوں نے بیان کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا، ان کے یہاں ذوق و سرمستی کی ان سرگذشتوں کی تفصیل بھلا کیسے مل سکتی ہے؟ اور سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کی گذرنے والی باتیں جس پر گذرتی ہیں، وہی کچھ ان سے واقف ہو سکتا ہے، لیکن بیان کرنا چاہے، تو شاید "معرض بیان" میں اس "اپنی آپ بیتی" کو شاید وہ خود بھی نہیں لا سکتا، صدق من قال

ذوق ایں مے نہ شناسی بخدا تا نچشی

چکھنے کا موقعہ کسی کو ملا ہو، تو اس سے بھی "چنانکہ افتد دانی" کے سوا شاید اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

بہر حال جہاں حاضر ہونے کے لئے سارے جہان سے غائب ہوئے تھے، وہاں کی حاضری سے شرف اندوز ہونے کے بعد جیسا کہ مولنا عاشق الٰہی صاحب نے خبر دی ہے،

"حضرت شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے" ص۲۳۹ تذکرۃ الرشید

اور حسب اطلاع مولنا حکیم منصور علی خاں حیدرآبادی

"مدینہ شریف میں جناب شاہ عبدالغنی صاحب کے مکان پر قیام کیا" ص۱۸۱ مذہب منصور

مکہ معظمہ میں قیام کا نظم جس طریقہ سے کیا گیا، اسے تو آپ سن ہی چکے، لیکن مدینہ منورہ پہنچ کر ان عزیز مہمانوں کو جس کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا، سمجھا بھی آپ نے یہ کون تھے؟۔

حضرت شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام تو و ہیں سے لیا ہے اور یاد رہا ہو' یا نہ یاد رہا ہو۔ مگر سیدنا الامام الکبیر کی تعلیمی زندگی کے زیر عنوان آپ کے جن استاذوں کا تذکرہ کیا گیا تھا' ان ہی بزرگوں میں عرض کیا گیا تھا کہ علم حدیث کی اکثر و بیشتر کتابیں سیدنا الامام الکبیر نے دلی میں ان ہی شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی تھیں حضرت گنگوہی رح نے بھی حدیث شاہ صاحب ہی سے پڑھی تھی، جس کا مطلب یہی ہوا کہ استاد نے اپنے سعید شاگردوں کو اپنا مہمان بنا یا تھا، لیکن کیا یہ تعلق صرف اسی حد تک محدود تھا؟ سنئے' یہ حضرت شاہ عبدالغنی یوں تو مجددی کی نسبت سے عام طور پر مشہور رہیں۔ لیکن ان کے مجددی ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ خاندان مجددیہ کے طریقہ میں مرید اور اسی خانوادہ صوفیہ کے مشائخ میں تھے۔ بلکہ حضرت مجدد سرہندی قدس اللہ سرہٗ سے نسبی تعلق بھی رکھتے تھے۔[لہ]

[لہ] شاہ عبدالغنی کے والد ماجد حضرت مولانا شاہ ابوسعید مجددی، حضرت مجدد کے صاحبزادے شاہ محمد معصوم کی اولاد میں تھے۔ شاہ ابوسعید مجددی کے والد ماجد کا نام شاہ صفی القدر تھا۔ اگا عن جد اپنی خاندانی خانقاہ کی مسند کی زینت بنے ہوئے سرہند ہی میں مقیم تھے کہ سکھوں کا فتنہ پنجاب میں اٹھ کھڑا ہوا' اور تو جو کچھ ہوا سو ہوا، حضرت مجدد کے وطن پاک کو بھی فتنہ کی اسی آگ نے گھیر لیا۔ الیانع الجنی کے مصنف مولنا محسن بہاری نے لکھا ہے کہ

جلا عنها عامرو هاو تفرقوا فی البلاد (الیانع الجنی، ص۸۴)	سرہند کے باشندوں کو سکھوں نے سرہند سے جلاوطن کردیا، ملک کے مختلف حصوں میں وہ تتر بتر ہو گئے۔

سرہند کے ان ہی مہاجرین میں حضرت شاہ صفی القدر بھی تھے۔ رامپور پہنچ کر انہوں نے بود و باش رامپور ہی میں ان کے صاحبزادے شاہ ابوسعید پیدا ہوئے، وہیں تعلیم کی تکمیل کرنے کے بعد دلی پہنچے' اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے صاحبزادوں شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہما سے علم حدیث کی سند حاصل کی، دلی ہی میں حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے مشہور خلیفہ شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ سے طریقہ مجددیہ کی عملی تربیت حاصل کرنیکے بعد ان کے خلیفہ و جانشین ہوئے۔ حج و زیارت کے سفر سے واپسی کے موقعہ پر ریاست ٹونک ہوتے ہوئے دلی آرہے تھے کہ ٹھیک عیدالفطر کے دن ٹونک ہی میں آپ کا وقت پورا ہو گیا۔ عام خلقت کے سوا خود نواب وزیرالدولہ فرماں روائے ریاست جنازے میں حاضر ہوئے، چالیس دن بعد آپ کا تابوت ٹونک سے دلی منتقل کیا گیا' اور اپنے شیخ (باقی اگلے صفحہ پر)

علم حدیث کی سند حضرت شاہ اسحاق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی۔ دینی تربیت اپنے خاص خاندانی طریقہ مجددیہ کے اصول کے مطابق والد ماجد سے پائی تھی۔ کچھ دن فقر و قناعت کی زندگی کے ساتھ حدیث کا درس دلّی ہی میں دیتے رہے، کہ غدر کے فتنہ میں دلّی کی زمین آپ پر تنگ ہوئی۔ ہجرت کر کے حجاز پہنچے مدینہ منورہ میں قیام اختیار فرمایا، اور وہیں کی ارض نبوت و رسالت میں آسودہ ہوئے، مدینہ منورہ کے قیام کے اسی زمانہ میں دلّی کے پڑھائے ہوئے، دونوں خاص شاگرد، حضرت گنگوہیؒ اور سیدنا الامام الکبیرؒ خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر مہمان بننے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

مدینہ منورہ ہی میں بیٹھ کر مولانا محسن بہاری نے "الیانع الجنی" میں یوں تو شاہ عبد الغنی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی مقام کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ

فهو اليوم عذيقها المرجّب والمحدّث بين لابتيها	مدینہ منورہ کے سب سے زیادہ بار دار درخت آج کل وہی ہیں اور اس کی دونوں پہاڑیوں کے درمیان کے تنہا محدث وہی ہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ ذرا سوچئے اس بات کو "طریقہ مجددیہ" کا خانوادہ گو اصلاً ہندوستان سے تعلق رکھتا تھا، مگر اسی ہندی "خانوادہ صوفیہ" کے چشم و چراغ بنے ہوئے جس زمانہ میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ میں اپنے محبوب پیغمبر کی حدیثوں کی نشر و اشاعت میں منہمک و مشغول تھے، اس وقت تک جانتے ہیں صوفیہ کے اس ہندی خانوادہ یعنی طریقہ مجددیہ کی عظمت و شہرت کا آفتاب چڑھتے ہوئے کہاں تک پہنچ گیا تھا، یہی مولانا محسن[۱] بہاری اسی کتاب "الیانع الجنی" میں راوی ہیں۔

(گذشتہ صفحہ سے) شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں دفن کئے گئے۔ ۱۲ تلخیص از الیانع الجنی ص۸۹ ص۸۹ ص۹۰

[۱] ہندوستان سے نکل کر حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے تجدیدی کارنامے اور ان کا خاص طریقہ تصوف اس زمانہ میں جب طریقہ مواصلات کی موجودہ آسانیاں خواب و خیال تھیں، اسلامی ممالک کے مشرقی و مغربی حدود کے آخری کناروں تک جو پہنچ چکا تھا حقیقی اور واقعی سبب (باقی اگلے صفحہ پر)

لاتری ناحیة من نواحی المسلمین من بلاد الھند وخراسان وماوراء النھر من بلاد الترک والتتر الی اقصی ثغرھا بالمشرق ثم ارض العراق، والجزیرہ وبلاد الحجاز والشام وقسطنطنیہ وما

یعنی اسلامی ممالک ہندوستان خراسان ماوراالنہر جن میں ترک اور تاتاری مسلمان آباد ہیں، ان ممالک کے آخری مشرقی سرحدوں تک اسی طرح عراق جزیرہ اور حجازی علاقے، شام اور قسطنطنیہ اور جو بھی ان کے قریب ہیں کوئی علاقہ ایسا نہ تھا کہ یہ طریقہ وہاں پھیل نہ گیا ہو، اور لوگ اسکی

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) تو اس کا وہی ہے، جو دنیا کے سارے آثار و حوادث کا واحد سبب ہے، یعنی حق سبحانہ وتعالیٰ کا ارادہ قاہرہ۔ لیکن ظاہر اسباب کی رو سے جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں۔ شیخ خالد کردی رحمۃ اللہ علیہ اس طریقہ کی عام اشاعت کا ذریعہ بنے۔ طریقہ مجددیہ کے شیخ وقت حضرت شاہ غلام علی سے دلی پہنچ کر شیخ خالد نے اس طریقہ کی عملی تربیت حاصل کی۔ وطن واپس ہو کر اس طریقہ کے مطابق تعلیم دینے لگے، عام اسلامی ممالک میں جس نے غیر معمولی حسن قبول حاصل کیا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ شیخ خالد کردی اپنے وطن شہر زور (کردستان) سے دلی جس شخص کی رہنمائی میں پہنچے، وہ بہار ہی کے ایک بزرگ مرزا رحیم اللہ بیگ تھے جو عام طور پر محمد درویش عظیم آبادی کے نام سے اپنے زمانہ میں مشہور تھے۔ حضرت شاہ عبدالغنی رح نے اپنے والد ماجد شاہ ابو سعید کے مختصر حالات کا اضافہ "مقامات مظہری" میں جو فرمایا ہے، اسی میں ارقام فرماتے ہیں کہ یہ مرزا رحیم اللہ بیگ بہاری، جہاں گشت سیاح تھے۔ روم و شام، حجاز، عراق مغرب و ماوراالنہر خراسان وغیرہ میں گھومتے رہتے تھے۔ اثنا سیاحت میں کردستان بھی پہنچے، جہاں ان کی ملاقات شیخ خالد کردی سے ہوئی جو اپنے علاقہ کے ممتاز علماء میں گنے جاتے تھے۔ مرزا رحیم اللہ بیگ نے شاہ غلام علی کا تذکرہ ان سے کیا جن کے وہ مرید اور خلیفہ تھے۔ ان ہی کی نشاندہی پر شیخ خالد کردی دلی شاہ غلام علی کی خدمت میں حاضر ہوئے، نو مہینے تک قیام کیا، خلافت و اجازت سے سرفراز ہو کر وطن واپس ہوئے قلوب ان کی طرف کھنچتے چلے جاتے تھے "گویا سلطنت آں دیار بایشان تعلق داشت" حضرت شاہ عبدالغنی کے محتاط قلم سے یہ الفاظ شیخ کردی کی شان میں نکل پڑے ہیں، یہ بھی شاہ صاحب نے لکھا ہی کہ شیخ خالد اگرچہ مرید خلیفہ حضرت شاہ غلام علی کے تھے لیکن اپنے مریدوں کو "بإطاعت والد ماجدم حکم کردہ بودند" جب حج و زیارت کے لئے حجاز شاہ ابو سعید شاہ عبدالغنی کے یہی والد ماجد پہنچے تو لکھا ہے کہ شیخ خالد کے مریدوں کا مجمع آپ کے سامنے یہ کہتے ہوئے جمع ہو گیا کہ مولانا (خالد کردی) بعد حضرت ایشان (یعنی شاہ غلام علی کے بعد) شمارا مقدم می داشت ص۲۰۲۔

والاهالانوقدانفی طریقتہ وجری علی السنۃ اهلها ذکرہ الیہ ینتمون وبہ ینبرکون	طرف اپنے کو منسوب نہ کرتے ہوں، اور اس سے برکت نہ حاصل کرتے ہوں۔

اور مدینہ منورہ ہی میں بیٹھ کر آگے اپنی ذاتی شہادت وہی یہ بھی قلم بند کرتے ہیں کہ

وقد دخلت طریقتہ الی اقصی المغرب مثل فاس[1] وغیرها	حضرت مجدد کا طریقہ مغرب کی بھی آخری حدود تک مثلاً فاس وغیرہ میں داخل ہو چکا ہے۔

بیرون ہند کے مسلمانوں میں "طریقہ مجددیہ" کو غیر معمولی حسن قبول جو حاصل ہوا، اگر یہ صحیح ہی کہ بظاہر اس میں زیادہ دخل شیخ[2] خالد کردی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے وجود باجود کو ہے، حاشیہ میں جس کی طرف اجمالی اشارہ کیا گیا ہے، اسی میں شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کی براہ راست اپنے قلم سے لکھی ہوئی یہ شہادت بھی نقل کی گئی ہے کہ شیخ خالد کردی اپنے مریدوں کو حضرت شاہ عبدالغنی کے والد ماجد کی اطاعت کا حکم دیتے تھے۔ ان کے اسی حکم کے مطابق

---

[1] الیانع الجنی کے حاشیہ پر انہوں نے مغرب اقصیٰ کے بعض علماء و مصنفین کی کتابوں مثلاً محمد بن عبدالرحمٰن الفاسی کی کتاب "المنہج البادیہ" اور العباسی کی کتاب کا حوالہ بھی دیا ہے، جن میں اطلاع دی گئی ہے کہ مغرب اقصیٰ کے ممالک و بلاد تک ہندوستان کا "طریقہ مجددیہ" کس طرح پہنچا اور وہاں احترام و اکرام کی کن نظروں سے دیکھا جاتا ہے ۱۲

[2] یہ میں نے اس لئے لکھا ہے کہ علاوہ شیخ خالد کردی کے حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کے متعدد ایسے خلفاء ہیں۔ جن کے ذریعہ طریقہ مجددیہ کی نشر و اشاعت بیرون ہند کے مسلمانوں میں ہوئی، جن میں ایک تو وہی بہاری بزرگ مرزا رحیم اللہ بیگ معروف بہ شیخ محمد درویش عظیم آبادی ہیں۔ سارے اسلامی ممالک کا دورہ کر کے اور حضرت مجدد کے کارناموں سے لوگوں کو روشناس کرتے کے بعد آخر میں مرزا رحیم اللہ بیگ خراسان کے شہر " " نامی میں مقیم ہو گئے وہاں کی حکومت نے جاگیر میں ایک گاؤں بھی نذر کر دیا تھا۔ بڑی خانقاہ قائم ہو گئی۔ لیکن بعض مقامی حکام کے اشارہ سے وہیں آخر میں شہید کر دیئے گئے، رحمۃ اللہ علیہ۔ اسی طرح شیخ جان محمد شیخ الحرم نامی بھی شاہ غلام علی کے خلفاء میں تھے عرب میں قیام اختیار کر لیا تھا، قسطنطنیہ کی ترکی حکومت کے حکام ان سے خاص عقیدت رکھتے تھے، خلیفہ وقت کی ہاں ان کے خاص عقیدت مندوں میں تھی۔ ضمیمہ مقامات مظہری ص۳۶

شیخ خالدؔ [۱] کے مرید عرب میں شاہ عبدالغنی صاحب کے والد ماجد شاہ ابوسعید کی خدمت میں قدم بوسی کے لئے حاضر بھی ہوتے تھے۔

ذرا ان معلومات کی روشنی میں اندازہ کیجئے کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ میں جب توطن پذیر ہو گئے تھے، اس وقت ان کا کیا حال ہوگا۔ مدینہ منورہ جہاں ان ہی اسلامی ممالک کے باشندوں کا تانتا ہی بندھا رہتا تھا، وہاں وہ کن نظروں سے دیکھے جاتے تھے، ان ہی کے مہمان بننے کا نظم قدرت کی طرف سے جن لوگوں کے لئے مدینہ منورہ میں کیا گیا تھا بقول مولٰنا عاشق الٰہی

"شاہ صاحب کو اس مجمع کے ساتھ جو کچھ تعلق یگانگت تھا، اس کا پوچھنا ہی کیا" ص ۲۳۹

ایسی صورت میں اگر یہ سمجھا جائے کہ سیدنا الامام الکبیر کے اس آخری دواعی حج کے موقعہ پر مکہ معظمہ میں جو کچھ دیکھا گیا تھا، مدینہ منورہ میں وہی یا اس سے بھی زیادہ کچھ دکھایا گیا ہو، تو اس پر متعجب نہ ہونا چاہئے، بیان کرنے والوں نے تفصیل نہیں کی ہے، لیکن صرف ایک ہی واقعہ کہ مدینہ منورہ میں اپنے استاذ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ کی مہمانی کی سرفرازیاں آپ کو میسر آئی تھیں، سب کچھ سمجھنے کے لئے کافی ہے، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عزیز مہمان مدینہ منورہ والوں ہی کے لئے نہیں، بلکہ عرب و عجم روم و شام مغرب و مشرق سے آنے والے زائرین کے مہمان عزیز بن گئے ہوں، تو واقعات کا آپ ہی بتائیے کہ اس کے سوا دوسرا اقتضا ہی کیا ہو سکتا تھا [۲]۔ مولوی عاشق الٰہی مرحوم نے لکھا

---

[۱] شاہ عبدالغنی نے اسی ضمیمہ میں شیخ خالد کردی کا ایک خط جو ان کے والد ماجد شاہ ابوسعید کے نام سے ہے نقل کیا ہے، جس میں شیخ خالد نے شاہ ابوسعید کو خبر دی ہے کہ یک قلم تمامی مملکت روم و عربستان، و دیار حجاز و عراق و بعضے ممالک قلم رو عجم و جمیع کردستان انجذبات و تاثیرات طریقہ علیہ سرشار و ذکر محامد حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ السامی آناء اللیل والنہار در محافل و مجالس، مدارس و مساجد زبان زد صغار و کبار است ص ۲ ضمیمہ

[۲] مولانا شبلی نعمانی نے اپنے سفرنامہ شام و روم میں لکھا ہے کہ قسطنطنیہ پہنچنے سے پہلے (باقی اگلے صفحہ پر)

ہے کہ

"مدینہ منورہ میں اس مقدس قافلہ نے کم و بیش بیس دن قیام کیا" ص۲۴۴

بیس دن کی اس مدت میں کیا کیا دکھایا گیا، کیا کیا سنایا گیا، دیکھنے والوں اور سننے والوں کے سوا دوسرے اُسے کیا جان سکتے تھے، اور اُسے کیا بتا سکتے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کی غیر معمولی نوازشوں کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے، کہ بقول مولوی عاشق الٰہی

"شاہ صاحب نہایت کم گو تھے ..... بلا ضرورت ایک بات بھی زبانِ مبارک سے نہ نکالتے تھے۔

اسی طرح جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں، عام طور پر ملنے جلنے میں بھی وہ حد سے زیادہ محتاط تھے۔ لیکن صرف اس لئے کہ ان کے خاص چہیتے شاگردوں کے ساتھ آئے ہیں مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

مجمع میں جو اجانب اور ناواقف اصحاب تھے، ان سے بھی شاہ صاحب نے اخلاق کریمانہ کے ساتھ مصافحہ فرمایا"

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ ان مہمانوں سے مل کر

"بہت مسرور ہوئے، اور عرصہ تک حالات پُرسی میں مشغول رہے" ص۲۳۹

حضرت شاہ صاحب کا جو حال تھا، اس کے لحاظ سے یہ معمولی واقعہ نہ تھا، اپنی کتاب میں خاص طور مولوی عاشق الٰہی نے اس کا جو تذکرہ کیا ہے، وہی دلیل ہے کہ ان کے عام طریقہ

(بسلسلہ صفحۂ گذشتہ) جہاز میں ان کی ملاقات ان ہی شیخ خالد کے بھتیجے شیخ عبدالفتاح سے ہو گئی تھی لکھا ہے کہ "شیخ عبدالفتاح کی یہی ملاقات میری تمام آئندہ کامیابیوں کا دیباچہ بنی" ص۲۴۴ مولوی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "شیخ خالد کی عظمت کا قسطنطنیہ میں یہ حال تھا کہ بجائے نام کے فرطِ ارادت و عقیدت سے لوگ ان کو صرف "حضرت" کہتے تھے" افسوس ہے کہ اس موقعہ پر بجائے شاہ غلام علی صاحب کے مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ شیخ خالد مرزا مظہر جانجاناںؒ کے مرید تھے حالانکہ مرزا صاحب تو ان کے دادا پیر تھے ۱۲

عمل کے پیش نظر گویا اس میں کچھ غیر معمولی ندرت تھی۔

حضرت شاہ صاحب کے دردولت پہان حضرات کے قیام کا زمانہ تو خیر اُن کی ملکوتی مجلس ہی میں گذرتا تھا، لیکن ان بیس دنوں میں مدینہ و اطراف مدینہ کے مآثر و مزارات پر حاضری کی تمنا جب مہمانوں کی طرف سے شاہ صاحب کی خدمت میں پیش ہوئی تو اپنے ایک خادم خاص عالم باعمل جو بخارا کے رہنے والے تھے، جن کا نام ہی ملا سفر تھا، شاید سیر و سفر ہی میں ان کی عمر گذری تھی، ان ہی ملا سفر بخاری کو شاہ صاحب کی طرف سے حکم دیا گیا کہ اپنے ساتھ لے جائیں، بلکہ مولانا عاشق الٰہی مرحوم کی روایت کے ان الفاظ سے کہ

"حضرت شاہ صاحب نے ایک شخص ملا سفر نامی بخاری کو ان حضرات کے حوالہ فرمادیا"

تو معلوم ہوتا ہے، کہ بخارا کے ان عالم صاحب ہی کو حضرت شاہ صاحب نے اپنے ان عزیز مہمانوں کے سپرد فرمادیا تھا، اور بقول ان ہی کے حکم دیا تھا کہ

"جہاں حاضر ہونا چاہیں، وہاں لیجائیں"

بیس دن کی مدت ناکافی مدت نہ تھی، مدینہ منورہ کی گلی گلی، کوچہ کوچہ سے بخارا کے یہ ملا سفر صاحب واقف تھے، راہ نمائی کے لئے جب وہی بخش دیئے گئے تھے، تو ظاہر ہے کہ جانے کی ہر وہ جگہ جہاں جانا چاہیئے تھا، وہاں نہ پہنچنے کی وجہ ہی کیا ہوسکتی تھی، شاید مولوی عاشق الٰہی نے چند خاص مقامات کا نام لیتے ہوئے لکھا بھی ہے کہ

"مسجد قبا، و قبلتین، ابیار سبعہ (یعنی مدینہ منورہ کے وہ سات کنویں جن میں سمجھا جاتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا لعاب دہن شریک کیا گیا تھا)، جبل احد وغیرہ سب ہی زیارتگاہوں پر حاضری دی اور خوب خوب گلہائے نِعَم خداوندی سے دامن دل بھرا" صفحہ ۲۱

دس دن کم تقریباً ایک ماہ کی یہ مدت نبی العالم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر طیبہ دپاک میں

اپنے شیخ الحدیث مرجع العرب والعجم کی مہمانی میں گذارنے کے بعد واپسی کا ارادہ جب کیا گیا، تو پہلے کہیں اس کا ذکر کر چکا ہوں، یعنی قافلہ کے ایک رفیق دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا رفیع الدین، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت والا میں گڑگڑا کر عرض کرتے رہے کہ

"حضرت مجھے تو اپنے قدموں سے جدا نہ کیجئے"

یاد ہوگا، حضرت شاہ عبد الغنی مجددی قدس اللہ سرہ ہی جیسے محتاط[۱] بزرگ کی زبان مبارک سے جواباً وہی یہ سن رہے تھے۔

"بھائی! دین کی خدمت بڑا کام ہے، شریعت محمدیہ کی خدمت خوش نصیبوں کو ملتی ہے، جب حق تعالیٰ تم سے اپنے دین کا کام لے رہے ہیں، تو اس میں حرج ڈالنا معصیت سے خالی نہیں"

تذکرۃ الرشید ص۲۴۱ ج ۱

"معصیت سے خالی نہیں" شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے واقعی یہی الفاظ نکلے تھے، تو ہجرت کے مسئلہ کی جو شہرت عوام تک جس شکل میں پہنچائی گئی ہے، اس میں اور مسئلہ کی اصل حقیقت میں کتنا فرق پیدا ہو جاتا ہے، یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس وقت تک ہندوستان وہ سب کچھ بن چکا تھا، جس کے بعد زمین کا کوئی علاقہ دارالاسلام باقی نہیں رہتا، اور مدینہ تو بہر حال مدینہ ہی تھا، نبی اور اصحاب نبی (صلوات اللہ علیہ وعلی صحبہ وآلہ وسلامہ) کا وہ دارالہجرۃ تھا، اور اس کے سوا بھی وہ کیا کچھ نہ تھا،

[۱] اور تو اور ڈاکٹر سر سید احمد خان کی شہادت آثار الصنادید میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ قلم بند ہوئی ہے کہ صرف اس خیال سے کہ ہندوستان میں جو طریق بیع وشراء (خرید وفروخت) بعض فواکہ وغیرہ کا جاری ہے وہ از روئے شرع شریف درست نہیں، ان چیزوں کے مزے سے واقف نہیں (باب چہارم ص۵۱) یعنی صرف اس اشتباہ سے جب تک دلی میں رہے ان پھلوں کو شاہ صاحب نے چکھا بھی نہ تھا۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ ان کے دینی حزم واحتیاط، تقویٰ وپارسائی کا کیا حال تھا۔۱۲

مگر باایں ہمہ مولٰنا رفیع الدین کو صرف حکم ہی نہیں دیا گیا، بلکہ اصرار کرکے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مدینہ منورہ سے ہندوستان واپس ہونے پر ان کو مجبور کیا، اور بقول مولانا عاشق الٰہی مرحوم

"مدینہ منورہ میں تخمیناً بیس یوم قیام فرماکر یہ مقدس (مدرسہ) مجمع (جس میں مولٰنا رفیع الدین بھی تھے) مکہ واپس ہوا"

مکہ پہنچ کر پھر حارۃ الباب والی وہی رباط جو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اسی سال پیش ہوئی تھی، وہی ہندوستان واپس لوٹنے والے اس قافلہ کی فرودگاہ قرار پائی، مولوی عاشق الٰہی صاحب کی اطلاع ہے کہ واپسی کے موقعہ پر

"باطمینان ایک مہینہ سے زیادہ مکہ معظمہ میں قیام کیا" ص۳۴

واپسی کے موقعہ پر مکہ معظمہ کے قیام کی مدت ایک مہینہ سے بھی زیادہ کیوں بڑھ گئی، منجملہ دوسرے اسباب کے بظاہر اس کا سبب جیسا کہ مولوی عاشق الٰہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، شاید یہ بھی تھا، پہلے بھی اس کی طرف کچھ اشارہ کیا جا چکا ہے یعنی ترکوں اور روسیوں میں جو جنگ پلونا نامی مقام پر ہو رہی تھی، اس جنگ کے نتیجہ کا غالباً انتظار تھا، مولوی صاحب ہی کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں کہ پلونا میں ترکوں کی شکست کی خبر جس وقت مکہ پہنچی، تو علاوہ طبعی رنج واندوہ کے انہوں نے لکھا ہے کہ واقعہ کی

"تحقیق کی طلب وفکر کے باعث پھر قصد سفر ملتوی کرنے پر مجبور کیا"

صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا کہ اس واقعہ کی تحقیق کی ضرورت اس حد تک کیوں محسوس کی گئی کہ مکہ معظمہ سے ہندوستان واپس ہونے کے لئے جو سفر شروع ہونے والا تھا وہ اچانک ملتوی ہو گیا، کس قسم کے سیاسی حالات تھے، اور ان بزرگوں کو اپنے خاص حالات کے لحاظ سے یہ فیصلہ کیوں کرنا پڑا۔

مگر " معصیت کا رنگ " مدینہ منورہ میں حضرت مولانا شاہ عبد الغنی رحمۃ اللہ علیہ کو مولانا رفیع الدین مرحوم کے اس فیصلہ میں نظر آیا تھا کہ " اب ہندوستان واپس نہ لوٹیں گے " دیکھئے مکہ معظمہ میں بھی التوار سفر کا جو فیصلہ کیا گیا تھا، اس فیصلہ کے متعلق مہاجر مکّی حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے عزیز روحانی فرزندوں کو کیا حکم دے رہے ہیں، ان کا یہ فقرہ تو شاید کسی دوسری جگہ بھی نقل کیا جا چکا ہے کہ " جو کچھ مقدر تھا، ہوا، اور جو ہونا ہے، وہ ہو کر رہے گا " اسی کے بعد جیسا کہ مولوی عاشق الٰہی نے نقل کیا ہے، کہ حاجی صاحب نے حکم دیا کہ

" جاؤ! بسم اللہ کرو "

اور وہی حاجی صاحب ہی کے ان الفاظ کے بھی راوی ہیں، مولانا گنگوہی کو خطاب کر کے فرما رہے تھے،

" آپ کی ذات سے اہل ہند کو جو نفع ہے، وہ ظاہر ہے، اسلئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب ہندوستان واپس ہوں " ص۲۱۱ تذکرۃ الرشید ج۱

ہندوستان کے باشندوں کو نفع پہنچانے کے لئے جس وقت حضرت مولانا گنگوہی مذکورہ بالا وداعی الفاظ کے ساتھ رخصت کئے جا رہے تھے۔ اور بقول مولوی عاشق الٰہی مرحوم

" اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب رحمہ اللہ) کے حکم پر حضرت مولانا (گنگوہی) سوائے تعمیل کیا کر سکتے تھے، واپسی کا قصد فرما لیا "

اور اسی قصد کے مطابق واپس بھی ہو گئے، ان ہی کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کو بھی دیکھنے والے تو یہی دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان ہی کی طرف واپس ہو رہے ہیں لیکن ہمارے مصنف امام جنہوں نے حج کے اس وداعی سفر کے متعلق لکھا تھا کہ " چلنے میں مولانا نانوتوی کو بھی ساتھ لے ہی لیا " وہی پلٹنے کی گھڑی کا ذکر کرتے ہوئے اطلاع

دیتے ہیں کہ اس سفر میں حضرت حاجی صاحب نے فرمایا تھا کہ

"مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) کی تحریر و تقریر کو محفوظ رکھا کرو۔"

اور اسی کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی بھی لوگوں کو وصیت کی کہ ان کو

"غنیمت جانو" ص۴۳ سوانح قدیم

اس وقت کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ کیا فرمارہے ہیں، اور اپنی اس وصیت سے ان کا مقصد کیا ہے۔ لیکن نہ دیکھنے والوں کو مذکورہ بالا الفاظ سے حضرت حاجی صاحب جو کچھ دکھانا چاہتے تھے جب واقعہ بن کر وہی سب کے سامنے آگیا، تو اس کو دیکھ کر جیسا کہ چاہیئے تھا، کہنے والے بقول مصنف امام کہنے لگے کہ

"ہائے افسوس! یہ خبر نہ تھی، کہ اس کے یہ معنی ہیں، اور یہ "واقعہ" اچانک آجائے گا۔" ص۴۴

اب ایک طرف حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ان کنائی اشاروں کو رکھئے، اور پھر ذرا اپنی اپنی یادداشتوں میں ان معلومات کو تر و تازہ کر لیجئے، جو کچھ دیر پہلے آپ تک پہنچائے گئے تھے، یعنی حج کے جس سفر میں رخصت کرتے ہوئے حضرت حاجی صاحب چونکنے والوں کو مذکورہ بالا الفاظ سے چونکا رہے تھے۔ یہ سفر ٹھیک اسی سال پیش آیا تھا، جس میں چند مہینے پہلے خداشناسی کے آخری میلہ سے بقول حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

"بحمد اللہ نصرت اسلام کا پھریرا اڑاتے ہوئے حضرت مولٰنا المعظم واپس تشریف لائے۔" (مقدمہ کتاب حجۃ الاسلام ص۲)

یاد ہوگا، ہمارے مصنف امام مولٰنا محمد یعقوب صدر اول دار العلوم دیوبند نے بھی خداشناسی

کے اس آخری میلہ سے واپسی کے بعد اپنے باطنی احساس کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا تھا کہ

"حق تعالیٰ کو ان سے (یعنی سیدنا الامام الکبیر سے) جو کام لینا تھا وہ پورا ہو چکا" حشؔ ارواح ثلاثہ

یہ بھی عرض ہی کر چکا ہوں کہ اس تیسرے حج کے سفر کا ارادہ آپ کے پیش نظر نہ تھا، بلکہ ساتھ لینے والوں نے کسی نہ کسی طرح آپ کو ساتھ لے ہی لیا تھا، ساتھ لے جانے والے ساتھ لئے جا رہے تھے، اور وہ بھی دیکھ رہے تھے۔ ہر دیکھنے والی آنکھ عظمت و احترام کے ان نظاروں کو دیکھ رہی تھی۔ کانوں سے رفع ذکر کے ان چرچوں کو سننے والے سن رہے تھے، جو اس شخص کے سامنے یکے بعد دیگرے لایا جا رہا تھا، جو تقریباً آج سے بیس سال پہلے یہ کہتے ہوئے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غار ثور میں تین ہی دن روپوش رہے ہیں"

دیوان کی ڈیوڑھی والے مکان کے زنانہ حصہ کے اس کمرے سے باہر نکل آیا تھا، جہاں روپوش ہونے کا مشورہ اس کو اس لئے دیا گیا تھا کہ آفتاب جس کے مقبوضہ علاقہ میں غروب نہیں ہوتا، وہی جبار حکومت اور اس کے ہرکارے اس کو پھانسی کے تختے پر چڑھانے کے لئے اسی طرح ڈھونڈھ رہے ہیں، جیسے ہندوستان کے ہزارہا ہزار باشندوں کو جوش انتقام میں انتہائی سنگدلی سے مسلسل پھانسی دیتے چلے جا رہے ہیں، پھانسی کے یہی کھمبے ملک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک گڑے ہوئے تھے، جن سے ہر تھوڑی دیر بعد مردہ لاشیں اتاری جاتی تھیں، اور جیتے جاگتے زندہ انسانوں کو ان ہی پر چڑھا چڑھا کر تڑپنے اور دم نکلنے کا تماشا دیکھا جا رہا تھا، ہندوستان کے بڑے رقبہ کا گوشہ گوشہ ان ہی تماشا گاہوں سے پٹا ہوا تھا، یہ سب کچھ جانتی ہوئی

سب کچھ سنتے ہوئے، بلکہ دیکھتے ہوئے، اسی تنگ و تاریک حجرے سے نکل کر اپنے آپ کو اسی نے ڈھونڈھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے دن کی روشنی میں پیش کر دیا تھا۔ صرف اس لئے پیش کر دیا تھا کہ

وکان حقا علینا نصر المؤمنین | اور ہم پہ مؤمنین کی نصرت کا حق ہے۔

یہی اس کو باور کرایا گیا تھا، اس شخص کی طرف سے باور کرایا گیا تھا، جس کے مقابلہ میں وہ طے کر چکا تھا کہ کسی کی کوئی بات باور نہیں کروں گا۔ دنیا جہان کے سارے باشندے بھی شک اندازی پر اکٹھے ہو جائیں گے، جب بھی اس کا فیصلہ یہی تھا، وہی سنوں گا جو وہ سنائے گا، وہی دیکھوں گا جو وہ دکھائے گا، وہی مانوں گا جو وہ منوائے گا، یہ اس کے محبوب، اس کی جان، اس کے دل کے مالک خاتم النبیین رحمۃ للعٰلمین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سمات تھی۔

جس کے پاس سب کچھ تھا، اسی قاہرہ، حکومت جابرہ کے مقابلہ میں اپنی ایمانی، صرف ایمانی طاقت کے ساتھ آکر کھڑا ہو گیا، وہی ان ہی آبادیوں، ان کی گلیوں، کوچوں میں دن دھاڑے، کھلے بندوں پھرتا رہا۔ جہاں اسی طاغیہ حکومت کے ہر کارے اپنی آنکھیں پھاڑے پھاڑے اس کو ڈھونڈھ رہے تھے، اور خدا ہی جانتا ہے، کہ کب تک ڈھونڈتے رہے۔ پھر اپنی روپوشی کے گوشہ سے وہ تین دن بعد اس لئے باہر نکل آیا تھا، کہ جسے اس نے اپنا محبوب بنایا تھا، اس کی جان اور دل کا وہی مالک بھی تین دن سے زیادہ ثور کے غار میں نہیں روپوش ہوا تھا تو جس نے اعلان کیا تھا کہ جسے تو محبوب رکھتا ہے، اسی کے ساتھ تو رہے گا، یعنی انت مع من احببت کی بشارت سنانے والے کی یہ بشارت پوری نہ ہوتی؟ معیت اور رفاقت جب اپنے اصلی رنگ میں حقیقت بن کر سامنے آئے گی، اس وقت اپنی اپنی پونجی، اپنے اپنے ظرف کے مطابق تجربہ کرنے والوں کو اس رفاقت و معیت کا تجربہ جن جن رنگوں میں

کرایا جائے گا، ان کا نظارہ تو اسی وقت کیا جائے گا۔ جب "پیش گاہ حقیقت" میں ہر مجاز واقعہ کا قالب اختیار کر کے سامنے آجائے گا۔ لیکن اس سے پہلے بھی، دکھاتا چلا آرہا ہوں۔ زندگی کے ہر موڑ پر، یہی موعودہ رفاقت اور یہی معہودہ معیت کن کن شکلوں میں محبت کرنے والے کے سامنے آتی رہی، پھر یہی خاکی زندگی اپنی تمام منزلوں سے گزرتے ہوئے آخری موڑ پر جب پہنچ چکی تھی، تو اس کے محبوب کی یہی معیت و رفاقت کیا اس کا ساتھ چھوڑ سکتی تھی؟

بات چنداں غیر مشہور بھی تو نہیں ہے؟ آخر تاریخ اسلام کی اس روایت کا ذکر جنہوں نے پڑھا نہیں ہے تو کیا سنا بھی نہ ہوگا، کہ روپوشی کے گوشۂ عافیت سے تین دن کے بعد جن کا نام لے کر، اور جن کے نمونہ اور اسوہ کو پیش کر کے نکلنے والا نکل پڑا تھا۔ ان ہی کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ "اللہ کی نصرت جب آگئی اور فتح ہوگئی، اللہ کے دین میں تم نے دیکھ لیا کہ لوگ جوق جوق داخل ہونے لگے، یعنی "اذا جاء نصر اللہ والفتح ورأیت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا" والے الفاظ سے شروع ہونے والی سورۃ "النصر" نامی نازل ہوئی، تو یہی سمجھا گیا؛ جیسا کہ بخاری وغیرہ میں ہے، کہ

هو اجل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعلمہ اللہ لہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت (ناگزیر) کی یہ خبر تھی، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے آگاہ کیا تھا کہ دنیا میں آپ کے قیام کی مدت کے ختم ہونے کی گھڑی آگئی۔

تو پیروی کرنے والے تابع اور خادم کے سامنے بھی جس پیمانہ پر سہی، لیکن اپنے متبوع اور مخدوم کی زندگی کے یہی نمونے جب جھلکنے لگے تو ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ وہ تنہا چھوڑ دیا گیا ہے۔ مگر توّاب یعنی جو سب سے بڑا رجوع کرنے والا تھا، اس نے تنہا اس کو چھوڑ نہیں دیا، بلکہ اپنی نصرتوں کے ساتھ وہ سامنے آیا، جس میدان میں دنیا

کے بڑے بڑے مذاہب و ادیان کے وکلاء اسلام کے مقابلہ میں جمع ہوئے تھے، اسی میدان سے فتح و کامرانی کا پھریرا اڑاتے ہوئے وہ واپس ہوا۔ جس کے بعد ہندوستان تو ہندوستان، آپ دیکھ چکے کہ حالات ہی قدرت کی طرف سے کچھ ایسے پیش آتے چلے گئے، کہ وہ عرب میں بھی پہچانا گیا، مصر و شام، ترکی اور مغرب اقصیٰ کے مسلمانوں میں بھی احترام کی نظروں سے دیکھا گیا، اور اس نظارے کو تو دنیا اب تک دیکھ رہی ہے کہ دیوبند کے قصبہ کا مقامی مدرسہ اسی کی بدولت ہمہ گیر جامعہ کی شکل اختیار کرنے کے بعد، صرف ہندوستان ہی کے مسلمانوں کا مرجع بنا ہوا نہیں ہے، بلکہ کابل بخارا چینی ترکستان، جاوا، سماٹرا، حد تو یہ ہے کہ مشرقی یورپ علاقہ روس وغیرہ کے طلبہ اس کی قائم کی ہوئی اسی جامعہ میں داخل ہو ہو کر تقریباً ایک صدی سے دینی تربیت حاصل کر کر کے اپنے اپنے اوطان کی طرف واپس ہو رہے ہیں۔

الغرض یہ اور، اس کے سوا اسی نوعیت کی دوسری چیزیں جب گذر رہی تھیں، تو اس پر تعجب کیوں کیجئے، اگر سمجھنے والے ان کو دیکھ کر وہی سمجھنے لگے، جو سورۃ النصر کے نزول کے بعد سمجھا گیا تھا۔

میں تو حیران رہ کر گیا، جب اسی سلسلہ کی روایتوں میں یہ روایت نظر سے گذری یعنی ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مشہور شاگرد قتادہ اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ ان کے استاذ ابن عباس اسی سورہ النصر کے متعلق یہ فرماتے تھے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر دی گئی ہے، اور آگاہ کیا گیا ہے کہ

انک لن تعیش بعدھا الا قلیلا	اس کے بعد نہ جیو گے تم مگر تھوڑی مدت کے لئے

قتادہ نے اس کے بعد یہ اطلاع دی ہے کہ

ما عاش بعدھا الا سنتین	اس سورۃ کے نازل ہونے کے بعد نہ زندہ

ثم توفی۔ | رہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مگر صرف دو سال
فتح القدیر شوکانی | (یعنی دو سال گذرنے کے بعد آپ کی وفات ہو گئی)

ادھر یہ روایت تو تفسیر کی کتابوں میں ملی دوسری طرف تذکرۃ الرشید میں، اسی تیسرے حج کے سفر کے سلسلہ میں مولوی عاشق الٰہی صاحب مرحوم نے یہ لکھتے ہوئے کہ

"الحمد للہ سارا سفر سہولت و راحت کے ساتھ انجام کو پہنچا"

آگے یہ لکھنے کے بعد جسے پہلے بھی کہیں نقل کر چکا ہوں یعنی

"البتہ مولانا محمد قاسم صاحب کو علالت لاحق ہوئی، جو بظاہر خفیف محسوس ہونے کی وجہ سے سفر کی مزاحم یا رفقاء کو پریشان بنانے والی تو نہ ہوئی، مگر آہستہ آہستہ بڑھ کر آخر کار وہی بیماری مرض الموت بنی"

اپنی اسی خبر کو ان الفاظ پر مولوی صاحب مرحوم نے ختم کیا ہے، لکھا ہے کہ

"اور تیسرے سال ۱۲۹۷ھ میں جان ہی لے کر گئی" ص ۲۴۲

گویا دو سال کا وقفہ یہاں بھی اس وقت کے حساب سے پیش آیا، جس وقت سمجھنے والے دوسروں کو سمجھانے لگے تھے،

"مولوی صاحب کی تقریر و تحریر کو محفوظ رکھا کرو، اور غنیمت جانو"

یہ وہی فقرہ ہے جسے تیسرے حج سے رخصت کرتے ہوئے، سیدنا الامام الکبیر کے متعلق یاد ہو گا، ان کے پیر و مرشد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا، مصنف امام نے جسے نقل کر کے لکھا تھا، کہ ان الفاظ میں حضرت والا کی وفات کی خبر دی گئی تھی، اللہ اللہ اختیاری اعمال و افعال میں اتباع و پیروی کا ارادہ کر لیا جاتا ہے تو ارادہ کرنے والوں کی لاہوتی محبوبیت کا ثبوت کن کن شکلوں میں پیش کیا جاتا ہے زندگی تو زندگی، موت تک میں پانے والے "محبوبیت کبریٰ" کے رنگ سے حصہ

پاتے ہیں، اور یہی ہے واقعی تفسیر ومحیای ومماتی للہ رب العلمین کی قرآنی آیت کی "روپوشی" کی عقل گداز، ہوش ربا، مصیبت میں بھی "غار ثور" کی مصیبت کی یاد جس کے حافظہ سے نہ نکل سکی، "فاتبعونی" کی پکار پر اس حال میں بھی لبیک کہتا ہوا وہ نکل پڑا، تو "یحببکم اللہ" کے وعدے سے اپنا حصہ آخر خود سوچئے، وہ کیوں نہ پاتا؟ "فالحیات حیاتہ والممات مماتہ"

بہر حال تیسرے حج کے اسی سفر میں رخصت کرتے ہوئے حضرت حاجی صاحب کو جو آگاہی بخشی گئی تھی، اس سے دوسروں کو بھی حالانکہ چونکا چکے تھے، لیکن ظہور و وقوع سے پہلے آگہی اگر ملتی بھی ہو، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس سے کچھ کترانا ہی چاہتے ہیں۔

واقعہ تو یہ ہے کہ نصرت ہو، یا فتح، یا دین اللہ میں جوق درجوق لوگوں کا داخلہ یا انفرادی طور پر سیدھی راہ پر کوئی ڈالا جائے، قرآنی محکمات میں بار بار صاف و واضح غیر مشتبہ الفاظ میں یہی یقین دلایا گیا ہے، کہ اللہ کے یہ سارے کام خود ہی اللہ انجام دیتا ہے، ماضی میں جو کچھ ہوا حال میں جو کچھ ہو رہا ہے مستقبل میں آئندہ جو کچھ ہوتا رہے گا سب کی ضمانت تنہا صرف اسی کا ارادہ قاہرہ و باہرہ ہے، جو حی و زندہ ہے، نہ اسے نیند پکڑتی ہے، اور نہ غنودگی اس کو چھو سکتی ہے، مگر یہ سب کچھ جانتے اور مانتے ہوئے بھی پہلے بھی یہی دیکھا گیا ہے، اور اب بھی یہی دیکھا جاتا ہے کہ ٹھیک ان ہی گھڑیوں میں جن میں سب سے زیادہ اس شعور کو بیدار اور اس یقین کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، ذہول اور بھول کا پردہ آدمی کے اس علم و یقین پر پڑ جاتا ہے، کام لینے والا اپنے وقت میں جس سے کام لیتا ہے، اور اپنی کارفرمائیوں کا ذریعہ یا جارحہ جن انفرادی ہستیوں کو بنا لیتا ہے، بجائے ذریعہ، اور جارحہ کے کچھ ایسا باور کر لیا جاتا ہے کہ سامنے سے اگر وہ ہٹ گیا، یا ہٹا لیا گیا، تو کاروبار کا سارا سلسلہ ہی درہم برہم ہو کر رہ جائیگا، کچھ اسی قسم کے شعوری یا غیر شعوری احساسات کو ذہول

اور بھول کے ان قصوں میں بظاہر زیادہ دخل ہوتا ہے، ذرا دیکھئے یہی ناگزیر واقعہ جو اس وقت زیر تذکرہ ہے اور تو اور ہمارے مصنف امام مولٰنا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ جو صبر و سکینہ میں شاید اپنے وقت میں اپنی آپ نظیر تھے[1] خدا شناسی کے میلہ میں جو کچھ دیکھا گیا تھا، صرف اسی کو ملاحظہ فرمانے کے بعد جہاں اپنے باطنی احساس کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا تھا، سنا ہی چکا ہوں، کہتے تھے کہ حق تعالیٰ کو ان سے (یعنی سیدنا الامام الکبیر سے) جو کام لینا تھا، وہ پورا ہو چکا، صرف یہی نہیں، بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ

"مجھے مولٰنا کی وفات قریب معلوم ہوتی ہے" ۱۸۱ ارواح ثلاثہ

لیکن وہی وقت جب قریب سے قریب تر ہو گیا، براہ راست ان ہی مولٰنا محمد یعقوب صاحب کو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ بالا وصیت سیدنا الامام الکبیر کے متعلق فرماتے ہیں، جس کا مطلب ان ہی کے بیان کے مطابق وہی تھا، جس کا احساس خدا شناسی کے میلہ کے واقعات کے بعد ہی ان کے قلب مبارک میں پیدا ہو چکا تھا، لیکن جب حاجی صاحب نے چونکایا تو یہی نہیں کہ جو چیز ان کو خود اپنے قلبی اشراق کی روشنی میں نظر آ چکی تھی، وہ ان کے دماغ سے اوجھل ہو گئی، حاجی صاحب کی تنبیہ پر بھی وہ یاد نہ آئی، بلکہ اس واقعہ کو سامنے کر کے جیسا کہ خود ہی اتہام فرماتے ہیں۔

"نہ کچھ پہلے حج سے بھی طبیعت ناساز تھی" ۳۲ سوانح قدیم

---

[1] قصص الاکابر میں حضرت تھانوی رح کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ چودہ آدمی ان کے گھر کے ان سے پیشتر چند ہفتوں کے اندر اندر مر چکے تھے۔ حکیم الامت رح نے جو ان کے براہ راست شاگرد تھے مذکورہ بالا الفاظ کے بعد یہ بھی فرمایا کہ وہ یعنی مولٰنا محمد یعقوب صاحبؒ بڑے صابر تھے کبھی نہ روئے نہ کوئی بے صبری کی بات منھ سے نکالی" صرف ایک دفعہ مولانا تھانوی رح نے سنا تنہائی میں مولانا روم کا یہ شعر پڑھتے تھے ۔ جز تسلیم و رضا کو چارۂ + در کف شیر نر خونخوارۂ -
(قصص الاکابر صـ۳۲)

اس خیال سے گرہ ہی کی راہ ان کا دماغ بنا تا رہا، گویا حج سے پہلے سیدنا الامام الکبیر کی طبیعت کا ناساز نہ ہونا، اس کو انہوں نے دلیل بنالیا کہ ابھی وہ واقعہ دور ہے، یہی نہیں حاجی صاحب سے رخصت ہونے کے بعد مکہ معظمہ سے قافلہ نکل کر پہلی منزل میں پہنچتا ہے، مصنف امام ساتھ ہیں خود لکھتے ہیں۔

"حضرت (حاجی صاحب) کی زیارت سے اور ان متبرک مکانوں کی زیارت سے مشرف ہو کر جب واپس ہوئے، بدّہ پہنچ کر مولانا کو بخار ہو گیا"

جدہ اور مکہ مکرمہ کی درمیانی سڑک کی یہ وہی منزل ہے یاد ہوگا جہاں جدہ سے جاتے ہوئے بھی سیدنا الامام الکبیر نے بجائے بحرہ کے اسی بدّہ نامی مقام میں منزل کی تھی، واپسی میں بھی پڑاؤ قافلہ کا اسی منزل میں ہوا۔ معلوم ہوا کہ حضرت والا کو کچھ بخار ہو گیا ہے، حاجی صاحب کی قولی تنبیہ کے بعد یہ دوسری فعلی تنبیہ قدرت کی طرف سے تھی۔ لیکن مصنف امام کے دماغ نے اس کو بھی ٹال ہی دینا چاہا، خود ہی فرماتے ہیں، کہ

"یہ خیال ہوا کہ جدائی ایسے بزرگ، اور بزرگ مقاموں، اور پیادہ پا زیادہ چلنے کے سبب سے ہے"

گویا سمجھا گیا کہ تعب اور تکان کی وجہ سے کچھ معمولی سی حرارت ہو گئی ہے، اسی حال میں جدہ پہنچے، مولوی عاشق الٰہی کی روایت ہے کہ

"جو جہاز (ہندوستان) جانے کو تیار کھڑا ہوا تھا، گو تنگیٔ جگہ کی تکلیف تھی" ص۲۴۱ تذکرۃ الرشید

لیکن ان ہی کا بیان ہے، کہ اسی جہاز سے واپسی کا ارادہ کر لیا گیا، بقول ان ہی کے اسی جہاز کے ٹکٹ لے لئے گئے، اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے بخار کو چنداں اہمیت نہ دی گئی، خود مصنف امام نے بھی لکھا ہے کہ

"جدّہ پہنچتے ہی، جہاز پر سوار ہو گئے"

آگے یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ

"اس جہاز کا لنگر اٹھنے والا تھا، اور دیگر جہازوں کی خبر عشرہ بلکہ دو ہفتہ تک کی تھی، اس لئے یہ خیال کیا کہ پندرہ روز میں بمبئی جا پہنچینگے"

اس جہاز میں جگہ کی تنگی تھی، اس کی طرف انہوں نے بھی ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کہ

"اتنی تکلیف اٹھالیں گے"

اور یہ بھی بیان کیا ہے،

"واقعی اس جہاز میں اتنی ہی تکلیف ہوئی، جتنی جاتی دفعہ جہاز میں آسائش وراحت پائی تھی"

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا کی ناسازی مزاج کی اہمیت کا احساس جہاز میں سوار ہونے کے بعد ہی ہوا، خدا ہی جانتا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کا واقعی حال کیا تھا، لیکن ساحل جدہ سے کشتیوں پر سوار ہو کر جہاز پر چڑھنے کے لئے قافلہ جب جا رہا تھا، یاد ہوگا، کسی موقعہ پر مولنا حکیم منصور علی خاں صاحب حیدرآبادی کا یہ بیان اسی کے متعلق گذر چکا ہے کہ

"وقت واپسی کے جدہ میں کشتیوں پر سوار ہو کر جب قافلہ جہاز پر سوار ہونے کو جا رہا تھا، تو اس قدر تیز و تند ہوا چلنے لگی، کہ کشتیاں دونوں اِدھر اُدھر قریب غرق ہونے کے جھک جاتی تھیں، ہر ایک کا رنگ زرد ہو جاتا تھا، مگر مولنا مرحوم (سیدنا الامام الکبیر) اپنے حال پر رہے" صـ۱۸۲

ظاہر ہے کہ دیکھنے والے آپ کے اس حال کو دیکھ کر اگر یہ سمجھ رہے تھے کہ معمولی خفیف حرارت کے سوا کسی خاص توجہ طلب بیماری میں آپ مبتلا نہیں ہیں، تو آخر اس کے سوا

وہ اور کیا سمجھ سکتے تھے، بہرحال جس طرح بھی ممکن ہوا، قافلہ جہاز میں سوار ہوگیا، ساحلِ جدہ سے جہاز کا لنگر اٹھا دیا گیا، مصنف امام کا بیان ہے کہ

"دو روز جہاز پر چڑھے ہوئے، ہوئے ہی تھے کہ مولٰنا کو دورہ صفراء معمولی ہوا اور بخار بھی" ص۲۱۲

بخار پر مزید اضافہ غلیان صفراء کا بھی شروع ہوا، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں، ہمارے مصنف امام اب بھی "معمولی" کا لفظ بڑھا کر اپنے دماغ کے سامنے خود اپنے قلب منور کے اشراقی احساس کو ابھرنے نہیں دیتے۔ مگر آہستہ آہستہ یہی صفراء کا غلیان بجائے معمولی ہونے کے غیر معمولی شکل اختیار کرنے لگا۔ مولٰنا حکیم منصور علی خاں مرحوم حیدرآبادی نے واپسی کے وقت جہاز میں سیدنا الامام الکبیر کی علالت کا تذکرہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی صفراوی غثیان نے بڑھ کر یہ صورت جہاز ہی میں اختیار کی، کہ

"بار بار استفراغ ہوتا تھا، یہ خادم (یعنی خود حکیم صاحب قبلہ مرحوم) اٹھا کر بٹھاتا، سلفچی میں استفراغ کراتا تھا، صرف صفرا ہی صفرا نکلتا تھا، کلی کرا کر پھر لٹا دیتا تھا"

وہی آگے یہ خبر بھی دیتے ہیں کہ

"دن اور رات میں کسی وقت اس قدر سکون نہ تھا کہ اچھی طرح خوابِ راحت ہو، ذرا دیر ہوئی، کہ استفراغ کا تقاضا ہوا"

مگر اسی کے ساتھ اپنی چشم دید شہادت حکیم صاحب قبلہ نے یہ بھی ثبت فرمائی ہے کہ

"جب نماز کا وقت آتا، وہ استفراغ موقوف ہو جاتا، اور بیٹھ کر اطمینان سے نماز پڑھتے"

لیکن جوں ہی نماز ختم ہوتی، ان ہی کا بیان ہے کہ

"پھر وہی دورہ پے در پے شروع ہو جاتا"۔

ایک دو دن نہیں، اسی عجیب و غریب حال کو یعنی نماز کے وقت نہ صفرا ہے، نہ استفراغ، اور نماز کے بعد پھر اسی کا سلسلہ شروع ہو جاتا، لکھا ہے کہ

"آٹھ روز تک یہی حالت رہی"

اور ہر دن کے پانچ وقتوں میں حکیم صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہی صورت پیش آتی رہی۔

بظاہر تعجب ہوتا ہے کہ جاتے ہوئے حج کے جس سفر میں دیکھا گیا تھا، کہ سیدنا الامام الکبیر گویا خود نہیں جا رہے ہیں، بلکہ لے جائے جا رہے ہیں۔ سہارنپور کے اسٹیشن پر جس وقت پہنچے، ایک حبہ بھی آپ کی جیب مبارک میں نہ تھا، لیکن ریل پر سوار ہونے کے ساتھ فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اتنا بڑھا کہ جو بے چارے حج کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، خدا ہی جانتا ہے کہ ان میں کتنوں کو یہ دولت میسر آئی، جہاز میں جو سہولتیں میسر آئیں، مصنف امام ہی سے سن چکے کہ "جتنی جاتے دفعہ جہاز میں راحت و آسائش پائی تھی"۔ پھر مسلمانوں کے دونوں پاک مقدس شہروں، بلد اللہ الامین اور مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں جو کچھ دکھایا گیا، اسے بھی آپ دیکھ چکے، صحت بھی جیسا کہ گذر چکا کہ اچھی رہی، لیکن ذہاباً جو کچھ بھی دیکھا گیا، بالکل اس کے برعکس ایاباً پہلی ہی منزل جدہ میں داخل ہوتے ہوئے، آپ بخار میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جدہ پہنچکر بجائے جہاز پر سوار ہونے کے وہیں چند دن اگر ٹھیر جاتے، تو اس زمانہ میں علاج کی جو ممکنہ صورتیں اس شہر میں میسر آسکتی تھیں ان سے استفادہ کا موقعہ مل جاتا، لیکن بخار ہی کی حالت میں جہاز پر آپ کو سوار کر دیا گیا، دو دن تک خیر جہاز میں صرف جگہ کی تنگی ہی کی شکایت تھی، لیکن ساحل کو چھوڑ کر جب سمندر کے درمیان جہاز ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں سے کسی قسم کی امداد خشکی سے نہیں پہنچ سکتی تھی، وہیں سے مرض کے اشتداد کا

سلسلہ شروع ہوتا ہے، یوں تو خود مصنف امام ہی طبیب تھے، حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک زمانہ میں طبابت ہی مشغلہ تھا، لیکن بیچ سمندر کی اس آبی آبادی میں جس کے چاروں طرف سینکڑوں میل تک پانی ہی پانی تھا، بقول مصنف امام

"وہاں نہ جگہ راحت کی، نہ دوا، نہ کچھ تدبیر" ص۴۲

اور قصہ اسی پر ختم نہیں ہو جاتا ہے، مصنف امام اسی کے ساتھ اس کی خبر بھی دیتے ہیں کہ جہاز کی اس منقطع عن الدنیا آبی آبادی میں اچانک وبا بھی پھوٹ پڑی، اور کیسی وبا؟ وہی لکھتے ہیں کہ

"ہر روز ایک دو آدمی انتقال کرتے تھے" ص۴۲

پہلے جہاز پر سوار ہونے کا یہ فائدہ جو سوچا گیا تھا کہ بمبئی چودہ پندرہ روز میں پہنچ جائیں گے، یہ امید بھی اس لئے پوری نہ ہوئی کہ عدن کی بندرگاہ پر پہنچنے کے بعد بقول مصنف امام

"وہاں قرنطینہ ہو گیا" ص۴۲

جس کی وجہ سے پہنچنے میں بجائے تعجیل کے تاخیر ہو گئی، اور قرنطینہ کی وجہ سے جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے

"نہ جہاز کے آدمی کنارہ پر اتر سکے، اور نہ شہر کے آدمی جہاز پر آ سکے" ص۴۳

مطلب جس کا یہی ہوا کہ عدن سے بھی دوا وغیرہ کے ملنے کی تھوڑی بہت توقع جو کی جا سکتی تھی، اس کا راستہ بھی بند ہو گیا، ذہاب وایاب یا جانے اور واپس لوٹنے کے ان متضاد حالات کو خود سوچئے کہ کہاں تک بخت واتفاق کا ان کو نتیجہ قرار دیا جاوے، جاتے ہوئے وہ نظارے کیوں پیش آئے تھے، اور آتے ہوئے، یہ سب کچھ جو دکھایا جا رہا تھا، اس کا واقعی راز کیا تھا؟ علام الغیوب کے سوا اس کا صحیح جواب کون دے سکتا ہے؟ لیکن رخصت کرتے ہوئے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

نے جس پیش آنے والے واقعہ سے آگاہ کر دینا چاہا تھا، اگر یہ سمجھا جائے اور یہی سمجھا بھی گیا ہے، کہ اسی واقعہ ناگزیر کی تمہید تھی، جس کی ابتداء واپسی کی پہلی منزل ھدّہ ہی میں شروع ہو گئی تھی، تو یہ جو کچھ ہو رہا تھا، ہم اس پر حیران کیوں ہوں، معصومیت کے انتہائی نقطۂ عروج میں مغفرت طلبی کا مطالبہ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں، اس لئے کیا گیا تھا کہ غیر معصوموں کی رائے بھی وہاں پر بت کا حکم رکھتی ہے، ایسی صورت میں غیر معصوم طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کا استغفار ان حالات کو اگر پیدا کرے جن کا سلسلہ اس سفر سے واپسی کی پہلی منزل سے شروع ہو گیا تھا، تو قطعی طور پر پاک و صاف کرکے اپنے جن بندوں کو ارحم الراحمین اپنے سامنے بلانا چاہتے ہیں، ان کے ساتھ اس کے رحم و رافت، عفو و مغفرت کا ظہور جیسا کہ صحیح حدیثوں میں ہے، عموماً ان ہی شکلوں میں ہوتا ہے[1]۔

---

[1] مسئلہ سے جو واقف ہیں، ان کے لئے تو میرے یہ اجمالی اشارے بھی انشاء اللہ کافی ہو سکتے ہیں، لیکن جو نہیں جانتے ہیں، ان کو چاہئے کہ قرآن کی آیت من یعمل سوءً یجز بہ (یعنی کسی قسم کی برائی کوئی کرے اس کا بدلہ اسے دیا جائے گا) کی تفسیر کا مطالعہ کریں۔ حاصل یہ ہے کہ قرآن کی یہ آیت جب نازل ہوئی، تو صحابہ جن میں سب سے پیش پیش خود صدیق رسالت حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض رسا ہوئے کہ یا رسول اللہ آپ پر ہمارے ماں باپ قربان ہوں، ہم میں ایسا کون ہے، جس سے کوئی برا کام نہ ہوا ہو، مطلب آپ کا یہی تھا کہ قرآن میں جب اعلان کیا گیا ہے کہ ہر برائی کا بدلہ دیا جائے گا، تو عفو و درگذر، مغفرت کے قانون کا مطلب پھر کیا ہو گا؟ جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوبکر تمہیں اور دوسرے اہل ایمان کو دنیا ہی میں برائی کا بدلہ اس طور پر دے دیا جاتا ہے کہ حتی تلقوا اللہ لیس لکم ذنوب (اللہ سے اس طور پر ملو کہ کسی قسم کا کوئی گناہ تمہارے ساتھ نہ ہو گا) دوسری روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایمان والوں کو کسی قسم کی بیماری، یا جسمانی تکلیف غم، الم دکھ وغیرہ جو کچھ بھی پہنچتا ہے ان کو پاک ہی کرنے کے لئے پہنچتا ہے۔ تا اینکہ پاؤں میں کوئی کانٹا بھی چبھ جائے، یا کسی معمولی چیز کے گم ہو جانے کی وجہ سے تردد دل میں پیدا ہو۔ یہ بھی ہے کہ چیونٹی بھی مومن کو اگر کاٹتی ہے تو گناہوں سے اسی دنیا میں اس کو پاک ہی کرنے کے لئے کاٹتی ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بہر حال دوسرے خواہ کچھ ہی سمجھیں، لیکن جس کے پیار اور محبت ہی کا مظاہرہ ذہاب کے موقعہ پر کیا گیا تھا، اپنا خیال تو یہی ہے، کہ اب بھی ایاب اور واپسی کے وقت جو کچھ ہو رہا تھا، وہ بھی اسی کے کرم و نوازش ہی کا ایک قالب تھا، روح ہر حال میں ایک ہی تھی۔

مصنف امام نے لکھا ہے کہ بے کسی اور بے بسی کے اسی حال میں مرض کی شدت کبھی کبھی بڑھ بڑھ کر اس درجہ تک پہنچ جاتی،

"ایک دن نوبت یہ پہنچی کہ ہم سب مایوس ہو گئے" ص۱۸۲

مولانا حکیم منصور علی خاں حیدر آبادی مرحوم نے بھی یہ خبر دیتے ہوئے کہ آٹھ دن تک جہاز پر حالت ایسی ہو گئی، کہ دن تو دن، راتوں کو بھی سیدنا الامام الکبیر کے بالین علالت پر مسلسل جاگنا پڑتا، خود اپنے متعلق لکھا ہے کہ

"ایک دن مجھ کو کئی رات جاگنے کی وجہ سے زیادہ تھکن اور اضمحلال ہو گیا"

اس دن بجائے حکیم صاحب کے ان ہی کا بیان ہے کہ

"اس رات کو جناب مولوی محمد منیر صاحب پاس بیٹھے رہے" ص۱۸۵

یہ وہی مولانا محمد منیر صاحب ہیں جو بقول حکیم صاحب مولانا مرحوم کے بچپن کے دوست

(گذشتہ صفحہ سے) آپ کو یہ ساری روایتیں درمنثور سیوطی میں ایک جگہ مل جائیں گی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بطور قانون کے اسی مسئلہ کی تعبیر یہ کی ہے کہ گناہوں کی سزا کی جگہ تو جہنم ہے لیکن مؤمن جب استغفار کرتا ہے تو جہنم والی سزا میں تخفیف کر دی جاتی ہے، بجائے جہنم کے برزخ یعنی قبر میں سزا بھگتتا ہے، لیکن مغفرت طلبی میں زیادہ زور لگایا جاتا ہے تو بجائے برزخ کے دنیا ہی کی تکلیفوں کا قالب جہنم کی سزا اختیار کر لیتی ہے، شاہ صاحب نے اسی لئے اس کا نام قانون تخفیف و تحویل رکھا ہے" جیسے چھ مہینے کی قید کو عذر و معذرت کے بعد مالی سزا، اور مالی سزا کو بھی زجر و توبیخ ڈانٹ ڈپٹ کی شکلوں میں تبدیل کر کے سزا کی نوعیت کو حکومتیں ہلکی کر دیتی ہیں۔ کچھ یہی حال اس قانون کا ہے، بس مکافات و مجازات کا قانون بھی باقی رہا، یعنی برائی کی سزا کسی نہ کسی شکل میں بھگتنی ہی پڑتی ہے اور تخفیف و تحویل کر کر کے مغفرت و عفو کا قانون بھی عمل کرتا ہے ۱۲

مخلص تھے، حج کے اس سفر میں اونٹوں کی سواری میں عموماً وہی ردیف بنائے جاتے تھے۔

مگر باوجود ان یاس انگیز حالات کے ہمارے مصنف امام اپنی ناامیدیوں کو مسلسل امیدوں ہی سے بدلنے کی کوششوں میں آخروقت تک سرگرم ہی رہے، خود ہی لکھا ہے کہ دل کو یہی سمجھاتے رہے کہ

"چند بار شدت مرض ہو کر اللہ نے شفا دی تھی، اب کی بار بھی وہی خیال باندھ رکھا تھا" ص ۳۴

اسی لئے تدبیر وسعی کا کوئی دقیقہ چاہتے تھے کہ اٹھا نہ رکھا جائے، دنیا سے منقطع ہوجانے کے بعد دواؤں وغیرہ کے نہ ملنے کی وجہ سے جو ذہنی کوفت ان کو ہوئی ہوگی، اس کا کون اندازہ کرسکتا ہے، مگر کچھ کر بھی تو نہیں سکتے تھے، خدا خدا کرکے عدن کے قرنطینہ سے جہاز کو نجات ملی، وہ آگے بڑھا، اور حضرموت کی بندرگاہ پہنچا، مصنف امام نے لکھا ہے کہ جہاز نے

"مکلّہ (حضرموت کی بندرگاہ) میں قدرے قیام کیا"

قدرے کا مطلب شاید یہی ہے کہ چند گھنٹوں کے لئے اس بندرگاہ میں جہاز مال وغیرہ اتارنے کے لئے ٹھیرایا گیا۔ مکلّہ کی آبادی سے ضرورت کی چیزیں لے کر لوگ ساحل پر آجاتے تھے، ان ہی لوگوں سے جیسا کہ لکھا ہے

"وہاں سے (یعنی مکلّہ سے) لیموں بکنے آئے وہ لئے، تربوز اور گلاب"

ان تروتازہ چیزوں کے ساتھ مسافروں کے پاس بھی بعض دواؤں کا پتہ چلا ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ

"بعض ادویہ جہاز میں مل گئیں"

جہاں کچھ نہیں مل سکتا تھا، وہاں یہ بھی جو کچھ مل گیا، اسی کو غنیمت شمار کیا گیا، مگر کچھ ایسا معلوم

ہوتا ہے، کہ ان سے بھی مرض کی شدت میں تخفیف کی صورت شاید پیدا نہ ہوئی، اگرچہ جہاز میں کمپنی کی طرف سے ایک ڈاکٹر بھی رہتا تھا، لیکن اس زمانہ کی ذہنیت کے مطابق ایلوپیتھک طریقہ علاج سے حتی الوسع گریز ہی کی کوشش کی جاتی تھی، مگر جب گھر کی دواؤں سے فائدے کی کوئی صورت ظاہر نہ ہوئی، تو مصنف امام ہی کا بیان ہے کہ

"جہاز کے ڈاکٹر نے کونین دی، اور مرغ کا شوربا غذا کو کہا۔"

کونین کا لفظ اس زمانہ میں دلوں میں جس اثر کو پیدا کرتا تھا، اب تو شاید اس کے جاننے والے ہم میں موجود نہ ہوں، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ایک قسم کا زہر ہی اس کو سمجھا جاتا تھا، اسی لئے اصلاحی بدرقہ کے بغیر کونین کے استعمال کا شاید کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، مرغ کے شوربہ کی تجویز غالباً بدرقہ ہی کے لئے کی گئی تھی، مگر بقول مصنف امام مصیبت یہ تھی کہ

"وہاں (یعنی اس منقطع عن الدنیا آبی آبادی میں) مرغ کہاں میسر تھا۔" ص۳۴

اصلاحی بدرقہ کے بغیر یہ زہر (کونین) کیسے استعمال کیا جائے؟

وہی جہاز کا ڈاکٹر جو غالباً کوئی فرنگی نژاد عیسائی ہی ہوگا، کونین کو استعمال کرانے کے لئے لکھا ہے کہ

"آخر مرغ بھی اپنے پاس سے دیا۔" ص۳۴

کسی نہ کسی طرح کونین کے استعمال پر لوگ راضی ہو گئے، پہلا فائدہ اس کا مصنف امام ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے یہ محسوس ہوا کہ

"مولنا (سیدنا الامام الکبیر) کو دورہ میں غذا سے نفرت مطلق ہو جاتی تھی، اب کچھ رغبت ہوئی۔" ص۳۴

جہاز کا یہ سفر ختم بھی ہو رہا تھا، مولنا حکیم منصور علی خاں نے لکھا ہے کہ

"جب بمبئی کے قریب پہنچے تے موقوف ہو گئی۔"

غذا کی طرف کچھ رغبت کے ساتھ قے کی موقوفی ان ہی دونوں باتوں کا نتیجہ جیسا کہ حکیم صاحب

نے اطلاع دی ہے یہ ہوا کہ

"اٹھنے بیٹھنے لگے"

ورنہ جہاز میں نماز کے وقتوں کے سوا، حکیم صاحب ہی نے لکھا تھا کہ

"ہر وقت لیٹے رہتے تھے"

لیکن نشست و برخاست کی جو صلاحیت پیدا ہوئی تھی، اس کا اندازہ مصنف امام کے ان الفاظ سے ہوتا ہے

"بمبئی ایسے پہنچ کر بیٹھنے کی طاقت دشواری سے تھی" ص۴۳

اسی لئے جہاز سے اترنے کے ساتھ ریل پر سوار کرادینا مناسب نہ خیال کیا گیا، بمبئی پہنچ جانے کے بعد مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"دو تین روز ٹھیر کر وطن کو روانہ ہوئے" ص۴۳

ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ قیام بمبئی کے ان دنوں میں نہ کسی قسم کا دورہ ہی قے وغیرہ کا پڑا، اور نہ کوئی دوسری شکایت محسوس ہوئی، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکیم صاحب نے لکھا ہے، کہ

"بمبئی میں اچھے رہے"

جیسا کہ پہلے کہیں لکھ چکا ہوں، کہ اس آخری وداعی حج کے سفر سے واپسی ۱۲۹۵ھ ہجری ماہ ربیع الاول کے اوائل میں ہوئی تھی، حساب سے ۱۸۷۸ء کے مارچ کے گویا ابتدائی دن تھے جس میں کافی خنکی عموماً ہندوستان میں باقی ہی رہتی ہے، مصنف امام نے وطن کی طرف روانگی کا ذکر کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے کہ

"ہر چند موسم سرما تھا"

اس کا مطلب یہی ہے کہ سرما کا موسم ابھی پورے طور پر ختم نہیں ہوا تھا، مگر سردی کا زور ظاہر ہے کہ مارچ کے مہینے تک ٹوٹ جاتا ہے، گو نہ دو۲ر سے موسم کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی

ہے' اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ گو ریل پر سیدنا الامام الکبیر سوار تو کرا دیئے گئے لیکن بقول حکیم منصور علی خاں حیدر آبادی مرحوم

"مگر نقاہت ما تی تھی، ریل میں اٹاوہ تک لیٹے ہوئے تشریف لائے"

اور ان کی یہ خوش قسمتی تھی جیساکہ خود ہی فرماتے ہیں کہ

"میری رانوں پر قدم مبارک رکھ لیا کرتے تھے" ص۱۸۵

ریل جا رہی تھی کہ مارچ کے دور سے موسم کا اثر نمایاں ہوا، جس کا ذکر مصنف امام نے بایں الفاظ کیا ہے

"جبلپور کے میدانوں میں دوپہر کو لو چلنے لگی"

ایک ایسا مریض جو بہ مشکل ریل میں لیٹے لیٹے سفر کی منزلوں کو پوری کر رہا تھا، اچانک پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر چلنے والی گرم ہواؤں سے جوں ہی کہ اس کا سابقہ ہوا۔ مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"مولنا کی طبیعت بگڑی" ص۴۳

یہ نہیں لکھا ہے، کہ کیا بگڑی بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ صفراہی میں پھر ہیجان و غلیان کی کیفیت پیدا ہوئی کیونکہ آگے وہی ارقام فرماتے ہیں کہ

"الحمد للہ اس وقت نارنگی، نیبو' یہ چیزیں پاس تھیں، کھلائیں پانی پلایا" ص۴۳

عموماً صفراہی کے دبانے کے لئے اس قسم کی ترش چیزیں استعمال کرائی جاتی ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب۔ جبل پور کے میدانوں تک یہ حالت رہی، یا آگے بھی دورے کی صورتیں پیش آئیں، جس طرح بھی ہوا، گاڑی اٹاوے تک پہنچی، اسی اسٹیشن پر جو صورت پیش آئی وہی لائق توجہ ہے، مولنا حکیم منصور علی خاں کے حوالہ سے عرض کر چکا ہوں کہ مرض کی آخری اشتدادی کیفیت میں بھی ایک چیز یعنی نماز کا وقت جب آجاتا تھا،

سیدنا الامام الکبیر بیٹھ کر نماز پڑھ لیا کرتے تھے، اپنے مالک و خالق کے ساتھ حضرت والا کے قلبی تعلق کی بیداری کا جس سے پتہ چلتا ہے، اب دیکھئے اسی کے ساتھ مخلوق کے حقوق کا کتنا اور کس حد تک خیال کیا جاتا تھا۔ حکیم صاحب ہی اس واقعہ کے راوی ہیں، بلکہ ان ہی کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا، عرض کر چکا ہوں کہ منجملہ دوسرے رفقار کے حج کے اس سفر میں سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ حکیم صاحب قبلہ بھی علیگڈھ سے ساتھ ہو گئے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ممکن تھا، اپنے استاد کی خدمت میں وہ اس سفر میں کچھ زیادہ پیش پیش رہے، خصوصاً واپسی میں حضرت والا جب بیمار ہوئے تو حکیم صاحب کی زبانی یہ بھی آپ سن چکے کہ مسلسل راتوں کو جاگ جاگ کر بسر کیا، جب قے ہوتی تو سلفچی لے کر حاضر ہوتے، کلیاں کراتے، حکیم صاحب تو اپنے اخلاص اور نیازمندی کے صادق جذبات کے تحت یہ سب کچھ کر رہے تھے، ان کے سامنے صلہ کا سوال ہی کیا ہو سکتا تھا، لیکن جس کے ساتھ وہ یہ سب کچھ کر رہے تھے، وہ ان کو ان خدمات کے صلہ سے کیسے محروم رہنے دیتا، حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ گاڑی جب اٹاوے کے اسٹیشن پر پہنچی، تو سب سے پہلی نوازش تو حضرت والا کی طرف سے یہ ہوئی، جیسا کہ حکیم صاحب نے لکھا ہے

"کہ اٹاوہ سے مجھ کو وطن جانے کی اجازت عطا فرمائی"۔ ص ۱۸۵

حالانکہ ایسے مخلص خادم کی علالت میں زیادہ ضرورت تھی، لیکن طویل مقدس سفر کے بعد حکیم صاحب واپس ہوئے تھے، قدرتاً وطن پہنچنے کی آرزو دلوں میں ہیجان انگیز ہوتی ہے، اولاً تو اسی جذبہ کی رعایت کی گئی، اور صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا گیا، بلکہ اسی کے ساتھ حکیم صاحب کو کچھ اور بھی دیا گیا، بظاہر دیکھنے میں تو وہ کوئی بڑی چیز نہ تھی، یعنی حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ

"اور چار روپے اپنے پاس سے عنایت کئے"۔

مگر یہ چار روپے کیا واقعی صرف چار روپے تھے، میں تو سمجھتا ہوں کہ اسی کے ساتھ حکیم صاحب ہی نے یہ خبر جو دی ہے، کہ

"اور پانچ روپے مکہ شریف میں مسجد ابراہیم علیہ السلام کی حد میں مجھ کو لے جا کر عطا فرمائے تھے۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی سمجھ گئے تھے کہ رخصت کرتے ہوئے ان کو چار روپے جو دیئے گئے، وہ درحقیقت چار روپے نہ تھے، بلکہ ان سے پیش تر مسجد ابراہیم جس سے غالباً مراد "خانہ کعبہ" والی مسجد حرام ہی معلوم ہوتی ہے، یا ممکن ہے کہ دخول کعبہ کے وقت حکیم صاحب کے ساتھ یہ نوازش فرمائی گئی تھی، بہرحال میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ اللہ کے خلیل نے جس مقام میں رزق کی برکت کی دعاء آنے والی نسلوں کے لئے کی تھی، اسی سرزمین میں پانچ روپے دے کر حکیم صاحب کو شاید رزقی برکت کی بشارت سے سرفراز فرمایا گیا تھا، وہ پانچ روپے بھی اسی کی علامت تھے، اور آخر میں رخصت کرتے ہوئے بھی کچھ اسی قسم کا اشارہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کیا گیا تھا[1]، بہرحال حکیم صاحب اٹاوے سے وطن یعنی مرادآباد روانہ ہو گئے، اور

[1] بزرگوں کے حالات میں لوگوں نے اسی قسم کے واقعات کا ذکر کیا ہے، خاکسار نے براہ راست حضرت مولٰنا محمد علی صاحب مونگیری نوراللہ مرقدہ سے سنا تھا کہ ان کے پیرومرشد حضرت مولٰنا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ رخصت کرتے ہوئے ایک مٹھی چنے آپ کی گود میں ڈال دیئے اور فرمایا کہ لو یہ دنیا دیتا ہوں، گو دینے کو تو صرف ایک مٹھی چنے ہی حضرت نے دیئے تھے لیکن حق سبحانہ وتعالیٰ نے مولٰنا محمد علی صاحب قدس اللہ سرہ کو دین کے سوا دنیا میں بھی رفاہیت وکشادگی وفراخی عطا فرمائی تھی، شاید بڑے بڑے نوابوں اور امیروں کے لئے آپ کی زندگی کا یہ رخ قابل رشک بنا ہوا تھا۔ خاکسار نے خود دیکھا تھا کہ صرف چار جو خانقاہ رحمانیہ میں خرچ ہوتی تھی پندرہ سیر یا آدھ من روزانہ سے کم شکر کے صرفہ کا تخمینہ اس کے لئے نہیں کیا جا سکتا۔ ایک باغ میں کوٹھی مسجد خانقاہ سب کا انتظام غیب سے کیا گیا تھا، جو بحمداللہ آج تک موجود ہے مجھے تو کچھ یہی حال مولٰنا حکیم منصور علی خاں مرحوم کا نظر آتا ہے، ان کی طالب علمی کا زمانہ کافی عسرت میں گذرا تھا، تقدیر نے ان کو (باقی اگلے صفحہ پر)

حضرت والا اپنے رفقاء کے ساتھ اپنے وطن واپس ہوئے مصنف امام نے لکھا ہے،

"وطن پہنچنے کے بعد مرض رفع ہوا، گو نہ طاقت آئی"

حکیم صاحب نے بھی اطلاع دی ہے، کہ

"میں جب وطن آیا، چند روز قیام کر کے نانوتہ پہنچا، اس وقت مولنا صاحب کو اچھا تندرست پایا" ص۱۸۶ مذہب منصور

مگر رفع مرض، یا تندرستی جس کا مشاہدہ وطن پہنچنے کے بعد کیا جا رہا تھا" واقعی حقیقت اس کی جو کچھ تھی، اس کا اندازہ مصنف امام کے ان الفاظ سے ہوتا ہے، لکھتے ہیں کہ

"مگر کھانسی ٹھیر گئی، اور کبھی کبھی، دورہ سانس کا ہونا، زیادہ بولنا دیر تک کچھ فرمانا مشکل ہو گیا" سیرت قدیمہ

الغرض ہدہ کی منزل میں اسی آخری وداعی حج میں بخار میں جو آپ مبتلا ہوئے، اس کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں باقی ہی رہا۔ البتہ اس میں کبھی کبھی کچھ تخفیف کی صورت پیدا ہو جاتی تھی لیکن حال جس کا یہ ہو، ابھی حکیم صاحب کی زبانی آپ سن چکے کہ زیادہ دن نہیں بلکہ چند روز ہی قیام کر کے اپنے وطن مراد آباد سے حضرت والا کی خدمت میں بہ مقام نانوتہ حاضر ہوتے ہیں، بظاہر پندرہ بیس روز سے زیادہ یہ مدت نہ ہو گی، مگر فرماتے ہیں، کہ

(گذشتہ صفحہ سے) حیدر آباد دکن پہنچا دیا، جہاں وہ طبیہ کالج کے پرنسپل ہو گئے تھے، اپنے علم و فضل اور تقوی کی زندگی کی وجہ سے عزت وجاہ کے سوا دنیاوی حیثیت سے بھی فارغ البالی کی زندگی آخر وقت تک بسر کرتے رہے اور یہ تو اپنی آنکھوں دیکھی بات ہے، خاکسار کے سامنے ان کے صاحبزادے حکیم منصور علی خاں حضور نظام کے دربار سے نواب مقصود جنگ کے خطاب سے سرفراز ہو کر حیدر آباد کے نوابوں میں شریک ہوئے، اعلیٰ حضرت حضور نظام کے دربار میں احترام و اکرام کا جو مقام حکیم صاحب کو حاصل ہے شاید وہ حکیم صاحب ہی تک محدود ہے۔ ہندوستان جب آزاد ہوا تو صدر جمہوریہ ہند کے خصوصی معالجین میں بحیثیت یونانی طبیب کے حکیم صاحب قبلہ ہی چنے گئے۔ بجائے ایک دفعہ کے دو دفعہ حکیم منصور علی خاں رویے سے جو سرفراز کئے گئے۔ شاید اس میں یہ اشارہ پوشیدہ تھا کہ دنیاوی فراغ بالی آئندہ بھی حکیم صاحب کی نسل میں جاری رہے گی۔ ۱۲

اسی زمانہ میں

"مجھ کو ملا جلال اول سے آخر تک پڑھایا"

صرف وہی نہیں بلکہ ان کے سوا بھی دوسرے تلامذہ کی بھی کتابیں شروع ہو گئی تھیں، حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ

"ان کے اسباق کی بھی سماعت کرتا تھا"

جس کے معنی یہی ہوئے، کہ مرض کے اتنے شدید حملہ کے بعد پندرہ بیس روز بھی آرام لینے کا موقعہ نہ ملا، اور ملا جلال جیسی معقولات کی اہم کتابوں کی درس و تدریس کے مشغلوں میں آپ مصروف ہو گئے، حالانکہ حکیم صاحب کا بھی بیان ہے کہ پڑھانے کی حد تک تو آپ پڑھا رہے تھے، اور پڑھانے کی رفتار کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے، کہ ملا جلال اول سے آخر تک حکیم صاحب نے پڑھ لی، تاہم وہی یہ بھی اطلاع دیتے ہیں،

"لیکن پہلی سی قوت نہ تھی"

اور بات صرف پڑھنے پڑھانے تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ چند مہینے بھی واپسی پر نہ گذرے تھے، ربیع الاول میں واپسی ہوئی تھی، کہ اسی سال شعبان میں گویا کل پانچ مہینے کے اندر اندر آپ کو پنڈت دیانند سرسوتی کے مقابلہ میں رڑکی کا سفر کرنا پڑا، رڑکی کا وہی سفر جس کی تفصیل گذر چکی، رڑکی کے بعد پنڈت جی ہی سے رو در رو ہونے کے لئے اسی زمانہ میں میرٹھ کا سفر بھی آپ کو کرنا پڑا۔ اسی عرصہ میں "قبلہ نما" جیسی نادر روزگار کتاب بھی لکھی گئی، اور "جواب ترکی بہ ترکی" کا مسودہ بھی اسی زمانہ میں تیار ہوا، جسے بعد کو مولنا عبد العلی نے مرتب کر کے شائع کیا۔ الغرض درس و تدریس، وعظ و تقریر، تالیف و تصنیف کے ساتھ ساتھ مدرسہ کے کام کا بار بھی حسب دستور اٹھاتے رہے، بیچ بیچ میں طبیعت پھر بگڑتی، مگر سنبھل سنبھل جاتی، تاہم کب تک؟ میرٹھ سے واپسی کے بعد مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"اس عرصہ میں چند بار جلد جلد وہی دورہ ہوا"

وہی دورہ کا مطلب بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ تنفس اور ضیق النفس کے دورے کم کم وقفوں کے ساتھ پڑنے لگے۔ مصنف امام کے ان الفاظ سے یعنی

"کئی بار صورت سانس کی سی ہو گئی" ص۴۴

یہی سمجھ میں آتا ہے۔

الغرض جو کچھ پیش آنے والا تھا، حالانکہ یہ سب جو کچھ بھی ہو رہا تھا، اسی کا مقدمہ تھا رخصت کرتے ہوئے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس پر تنبیہ فرما چکے تھے، اور اس سے بہت پہلے اپنے قلبی اشراق کی روشنی میں خود مصنف امام بھی دیکھ چکے تھے، دوسروں کے سامنے اپنے اس باطنی احساس کا اظہار بھی ان الفاظ میں کر چکے تھے کہ "اب مولنا کی وفات قریب معلوم ہوتی ہے" لیکن اسی کے مقدمات جب سامنے آنے لگے، تو ان کا دماغ مسلسل اسی کوشش میں رہا، کہ جو واقعہ قریب آ چکا ہے، جہاں تک ممکن ہو، سمجھا جائے کہ ابھی وہ دور ہے، سانس کے یہی دورے جب جلد جلد پڑنے لگے اور سانس یعنی دمہ کی کیفیت پیدا ہو گئی، لیکن وقتی طور پر کچھ افاقہ ہو جاتا، تو وہی ارقام فرماتے ہیں،

"یوں خیال تھا کہ اب یہ مرض ٹھیر گیا (یعنی مزمن ہو گیا ہے) خیر دوا ہے" (جس سے مایوس ہونے کا کوئی موقعہ نہیں) ص۴۴

گویا مریض نہ ٹھیرے گا، مرض کے ٹھیر جانے سے یہ کیوں نتیجہ نکالا جائے؟ ان کا دماغ یہی سمجھاتا رہا اور دلاسا دیتا رہا کہ

"چند بار شدت مرض ہو کر اللہ تعالیٰ نے شفا دی تھی، اب کی بار بھی وہی خیال باندھے رکھا"

الغرض اتار، چڑھاؤ، گھٹاؤ، بڑھاؤ کے یہ قصے یوں ہی جاری رہے، جس کا ذکر کرتے ہوئے

مصنف امام نے ارقام فرمایا ہے کہ

"دو برس اسی کیفیت پر گذر گئے، کہ گاہ کچھ صورت تخفیف کی ہو کر قدرے طاقت آئی، اور پھر دورہ سانس کا ہوا، اور وہی صورت ضعف کی ہو گئی"

لکھا ہے، کہ ضعف کی یہ صورت جو سانس کے حملہ کے بعد پیش آجاتی تھی، اس کی نوعیت یہ ہوتی تھی کہ

"ایک روز کے مرض میں مدتوں کی طاقت سلب ہو جاتی تھی"

مگر دو سال کے اس الٹ پھیر میں کام کرنے والا اپنے کام میں بہر حال مشغول تھا، پڑھنے والوں کو پڑھاتے بھی رہے، جہاں وعظ و تقریر کی ضرورت ہوتی، وہاں پہنچ پہنچ کر وعظ و تقریر کے سلسلہ کو بھی جاری رکھا، لکھنے کی ضرورت ہوئی، تو اس ضرورت کو بھی پورا فرماتے رہے۔ اور اس کے سوا بھی آنے جانے والے اپنے وساوس و شبہات کو آآکر پیش کرتے، آپ ان کے خیالات کی تصحیح میں جہاں تک ممکن تھا، سعی و کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے، اسی قصہ سے اندازہ کیجئے جس کا ذکر میر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ سے ارواح طیبہ میں کیا گیا ہے، تفصیل کے لئے تو اسی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ لکھنؤ کے ایک مشہور عالم اور طبیب جن کا نام مولٰنا حکیم عبد السّلام تھا۔ یہ بھی لکھا ہے، کہ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے کسی زمانہ میں طبیب خاص بھی رہ چکے تھے، ان کو سیدنا الامام الکبیر سے ملنے کا شوق تھا، جو پورا نہ ہوتا تھا، اسی زمانہ میں جب سانس کے دورے جلد جلد پڑنے لگے تھے اور علاج کے لئے دیوبند ہی میں حضرت والا کا قیام تھا، یہ حکیم صاحب وہیں پہنچے، وہ چاہتے تھے کہ کسی اہم علمی مسئلہ پر براہ راست مولٰنا کی تقریر سے مستفید ہوں، لیکن اس زمانہ میں حالت ایسی تھی کہ اس قسم کی تقریر کا بار ڈالنا کوئی پسند نہ کرتا تھا،

مگر حکیم صاحب کی خوش قسمتی تھی کہ مجلس مبارک میں جس وقت حاضر ہوئے، ایک صاحب سہارنپور کے بھی بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے کسی پادری کے اس اعتراض کا ذکر چھیڑ دیا کہ قرآن ہی میں ہے کہ خدا کے کلام کو کوئی بدل نہیں سکتا، اور اسی میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے، کہ تورات وانجیل میں تحریف کی گئی ہے، لکھا ہے کہ اعتراض کا سننا تھا کہ حضرت والا پر جوش کی سی ایک کیفیت طاری ہوگئی، اس کے بعد کیا ہوا؟ میر شاہ خان صاحب راوی ہیں، کہ

"دن کے آٹھ بجے سے کھانے کے وقت تک تقریر فرمائی.... ظہر کے بعد حکیم عبدالسلام نے پھر یہی مضمون چھیڑ دیا، اور مولانا نے ظہر سے عصر تک یہی مضمون بیان فرمایا، اور مغرب سے عشا تک یہی مضمون بیان فرمایا، اور عشاء کے بعد پھر یہی مضمون شروع کر دیا"

پھر اس کا سلسلہ کہاں تک دراز ہوا، میر شاہ خان صاحب کہتے تھے کہ

"جب رات کے بارہ بج گئے، تب میں نے زور سے کہا کہ حکیم صاحب اٹھئے، بہت دیر ہوگئی، اور اب مولانا کو آرام کرنے دیجئے، تب حکیم صاحب اٹھے اور تقریر ختم ہوئی"[۱] ص۱۶۴ ارواح ثلاثہ

[۱] میں نے خود بھی یہ واقعہ بہت تفصیل کے ساتھ حاجی امیر شاہ خان صاحب کی زبان سے سنا ہے اور غالباً ارواح ثلثہ میں اسی تفصیل کے ساتھ یہ واقعہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ حضرت والا کی تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ قرآن کلام اللہ ہے جس کا تکلم حق تعالیٰ نے فرمایا ہے گو اسے لکھ کر بھی دیا گیا ہے، جس سے اس کو کتاب مرقوم بھی فرمایا گیا ہے، اور توراۃ وانجیل کتب الٰہیہ ہیں۔ کلام نہیں ہیں، کلام صفت خداوندی ہے جس میں تبدیل و تغییر ناممکن ہے۔ کتب اور مضامین میں تبدیلی او ضیاع ممکن ہے نیز کلام تکلم کے بعد جوّ اور فضاء میں محفوظ ہو جاتا ہے، جسے کوئی مٹا نہیں سکتا (چنانچہ آج سائنس دانوں نے اسے تسلیم کر لیا ہے کہ بنی آدم نے اپنی ابتدا آفرینش سے جو کلام کئے ہیں وہ سب جوّ میں محفوظ ہیں، ماہرین سائنس مدعی ہیں کہ ہم نے آلات کے ذریعہ یہ قدیم آوازیں سن لی ہیں، مگر شور کی شکل میں ایک کلام کو دوسرے کلام سے ہم تمیز نہیں کر سکے ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

دو سال کی طویل علالت کا یہ آخری زمانہ ہے، کیونکہ اسی روایت میں ہے کہ یہ اس زمانہ کی بات ہے، جب شیخ الہند حضرت مولٰنا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کے مکان میں سیدنا الامام الکبیر مقیم تھے، اور یہ معلوم ہے کہ ایام علالت کے آخری دنوں میں آپ اس مکان میں لاکر ٹھیرا دیئے گئے تھے، مرض بھی دمہ اور ضیق النفس کا تھا، جس میں کھانسی کا ایک ٹھسکہ مریض کے ہوش و حواس درہم و برہم کر دینا ہے، لیکن اب اسے کیا کہئے کہ آٹھ بجے دن سے رات کے بارہ بجے تک بجز ضروری وقفوں کے آپ مسلسل تقریر فرماتے رہے۔ میر شاہ خان موجود تھے، کہتے تھے کہ اس طویل عرصے میں یہ عجیب اتفاق پیش آیا کہ

"اثنائے تقریر میں ایک مرتبہ بھی کھانسی نہ اٹھی، اور تقریر کی برجستگی میں ذرا بھی خلل نہیں آیا"

حکیم صاحب والی اس تقریر کے موقعہ پر تو خیر کھانسی نہ اٹھی، جس کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، لیکن واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانسی کے اٹھنے کی بھی بسا اوقات پروا نہیں کی جاتی تھی۔ مصنف امام ہی نے لکھا ہے کہ وفات سے چند روز پہلے جب طبیعت کچھ ذرا سنبھل گئی تھی، تو اپنے صاحبزادے مولوی علاء الدین صاحب کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ

"علاء الدین بندہ زادہ کی استدعا پر کچھ پڑھانا بھی شروع کیا،

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) لیکن اس تمیز کے حاصل کرنے کے لئے مساعی اور تجربات جاری ہیں، اور ہم عنقریب دنیا کو وہ خطبہ سنوا دیں گے جو حضرت مسیح علیہ السّلام نے حواریوں کے سامنے ارشاد فرمایا تھا، جس سے اندازہ کر لیا جائے کہ جب مخلوق کا کوئی بولا ہوا کلام ضائع نہیں ہو سکتا، اسے فضاء نے چوس رکھا ہے اور وہ اس کے خلاء میں محفوظ ہے، تو خالق کے بولے ہوئے کلام کو کون سی طاقت ہے کہ فنا کر دے، یا بدل ڈالے۔ لیکن کتاب یا مضمون بدلا بھی جا سکتا ہے اور ضائع بھی ہو سکتا ہے۔ ۱۲ محمد طیب غفرلہ

بعد عصر کچھ ترمذی کی ایک دو حدیث ہوتی، جب تک کھانسی نہ اٹھتی بیان فرماتے تھے، اور جب کھانسی کم ہوتی، تب بھی ذرا ٹھیر کر بیان فرماتے، اور جب شدت ہوجاتی، موقوف فرمادیتے۔" ص۴۵

گویا وہی حسرت مرحوم کا مشہور زبان زد عام شعر یاد آجاتا ہے کہ ؎

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
ایک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

مرض بھی ہے، تکلیف بھی ہے، لیکن ع

جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

کا سلسلہ شاید اسی وقت ٹوٹا جب اس خاکدان ارضی ہی سے رشتہ ٹوٹ گیا۔

ادھر سیدنا الامام الکبیر تو اپنے مشاغل میں مصروف تھے، دوسری طرف علالت کی اسی طوالت کی وجہ سے آستانہ قاسمی کے نیازمندوں کو علاج و معالجہ کے متعلق اپنے ارمانوں کے پورا کرنے کا وسیع موقعہ اس لئے میسر آیا، کہ خلاف دستور اپنی اس بیماری میں حضرت والا نے اپنے آپ کو تیمارداروں کے سپرد فرمادیا تھا، مطلب یہ ہے کہ یوں تو پیدائشی طور پر حضرت والا جیسا کہ مصنف امام کا قول نقل کرچکا ہوں،

"معتدل القویٰ اور معتدل المزاج تھے"

اسی لئے بیمار بھی کم پڑتے تھے، اور اتفاقاً کبھی ایسی صورت پیش بھی آجاتی تو علاج و معالجہ کے بہت کم عادی تھے، اس سلسلہ میں کچھ کرتے بھی، تو اس کا اندازہ اسی واقعہ سے کیا جاسکتا ہے، پہلے بھی اس کا ذکر گزرا ہے کہ شدت بخار میں تازہ ٹھنڈے پانی سے جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے غسل کرلیتے، اور اسی قسم کی علاجی تدبیروں سے شفایاب بھی ہوجاتے، لیکن اپنی اس آخری علالت میں شروع ہی سے دوسرا رنگ تھا،

مصنف امام نے بھی لکھا ہے کہ

"مولنا نے برخلاف عادت اس مرض میں جو علاج ہوا، اس کو قبول کیا،

جو دوا کھلائی کھالی، جو تدبیر کسی نے کی، اس کو کرلیا" ۲۴۲

ابتداء علالت ہی میں آپ دیکھ چکے، کہ جہاز کے ڈاکٹر کے علاج سے بھی آپ نے انکار نہیں فرمایا، اور جس شخص کا حال انگریزوں کی طرف منسوب ہونے والی چیزوں کے متعلق یہ تھا کہ ساری عمر بجائے بٹن کے گھنڈیوں ہی کے استعمال پر اس لئے اصرار کرتے رہے کہ بٹن کو بھی ان ہی چیزوں میں شمار کرتے تھے، جن سے ملک کو انگریزوں نے روشناس کیا تھا، مگر باوجود اس کے کونین جو اس زمانہ میں اچھی خاصی بدنام دوا تھی، انگریزوں کی اس دوا کو بھی بخوشی آپ نے استعمال فرمایا، اور کونین ہی کی وجہ سے انگریز ڈاکٹر کے احسان کو جو شوربے کے لئے مرغ دے کر اس نے کیا تھا، اس احسان کے اٹھا لینے پر بھی آمادہ ہو گئے، اور یہ واقعہ تو خیر جہاز کا تھا، وہاں تو گونہ ایک قسم کی مجبوری کا بھی عذر کیا جا سکتا ہے لیکن وطن واپس ہونے کے بعد پہلے تو آپ کے مشہور فدائی طبیب دیوبند کے رہنے والے حکیم مشتاق احمد صاحب[ل] مرحوم نے آپ کا علاج اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

[ل] حکیم صاحب مرحوم کا ذکر مختلف مقامات پر گذر چکا ہے، مولنا طیب صاحب نے اپنے خط میں ان کے متعلق لکھا ہے، کہ

"دیوبند کی شیوخ کی برادری میں اول نمبر کے آدمی سمجھے جاتے تھے، حاذق طبیب تھے جنکی طرف سارا شہر رجوع کرتا تھا"

سیدنا الامام الکبیر سے نیازمندی اور فدائیت کا جو تعلق رکھتے تھے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولنا نے لکھا ہے کہ

"حضرت کے خاص لوگوں میں تھے، اور حضرت کے فدائی تھے"

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ

"حکیم صاحب مرحوم نے اپنے مال کا وافر حصہ حضرت (سیدنا الامام الکبیر) پر خرچ کیا"

(باقی اگلے صفحہ پر)

اخلاص و نیاز کے غیر معمولی تعلقات کے سوا حکیم صاحب اپنے وقت کے طبیب حاذق تھے، مشہور ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کبھی کبھی فرمایا کرتے کہ دیوبند میں کل ڈھائی ذہین ہیں، پورے ذہین ایک حکیم مشتاق احمد صاحب اور دوسرے منشی نہال احمد کو فرمایا اور شیخ منظور احمد کو نصف ذہین قرار دیا تھا اور فرماتے کہ جب ان میں سے کوئی میرے وعظ میں سامنے بیٹھ جاتا ہے تو طبیعت کھل جاتی ہے، اور مضامین کی آمد شروع ہو جاتی ہے کہ سمجھنے والے موجود ہیں۔ الغرض دل و دماغ دونوں ہی لحاظ سے علاج کے لئے حکیم صاحب سے بہتر آدمی دیوبند میں اور کون ہو سکتا تھا، جو کچھ ان کے بس میں تھا، ظاہر ہے کہ بھلا کوئی دقیقہ انہوں نے اٹھا رکھا ہوگا، مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی آخر تک مصروف رہے"

گویا معالج بھی وہی تھے، اور تیمار دار بھی، علاج جب تک ممکن ہوا، کرتے رہے جب اپنی یونانی ترکیبوں سے تھک گئے، تب حضرت والا کے عاشق زار اور مرید خاص ڈاکٹر عبدالرحمٰن[1] صاحب نے اپنے آپ کو پیش کیا، حکومت کی طرف سے مظفر نگر جیل

(گذشتہ صفحہ سے) اس کا ذکر کر بھی چکا ہوں، کہ آج کل سیدنا الامام الکبیر کے اہل بیت دیوبند کے جس مکان میں سکونت پذیر ہیں۔ حکیم صاحب ہی نے اس کو خرید کر حضرت والا کی اہلیہ محترمہ یعنی مولانا طیب صاحب کی دادی صاحبہ کے نام باضابطہ وثیقہ کے ساتھ نذر کر دیا تھا، اور بعد کو بھی اپنی طرف سے اس مکان کی ترمیم و تعمیر پر کافی روپیہ صرف فرما دیا، بلکہ سیدنا الامام الکبیر کی آخری خواب گاہ کے ہونے کا شرف دیوبند کی جس خاک پاک کو حاصل ہوا، اور آج خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے اہل علم و فضل، اصحاب تقویٰ و دیانت کا جو مقبرہ ہے۔ زمین کا یہ مقدس قطعہ بھی حکیم صاحب ہی کا پیش کیا ہوا ہے، خود بھی سیدنا الامام الکبیر کی پائنتی میں دفن ہیں۔ دارالعلوم کے ابتدائی دور میں حکیم صاحب ممدوح اس کے ممبر اور رکن رکین بھی رہے ہیں۔

[1] ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کے متعلق خاکسار نے مولانا طیب صاحب سے پوچھا تھا کہ کچھ حالات ان کے معلوم ہوں، تو لکھئے، جواب میں مولانا نے ارقام فرمایا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر سے ڈاکٹر صاحب والہانہ تعلق رکھتے تھے۔ حضرت والا کے بال بچوں میں کسی کی بیماری کی خبر جوں ہی ان تک پہنچی (باقی اگلے صفحہ پر)

کے پیشہ کاری ڈاکٹر تھے، یہی نہیں کہ وہ صرف معالج مقرر ہوئے، بلکہ مولٰنا حکیم منصور علی خاں حیدرآبادی کا بیان ہے کہ

"ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب نے علاج کے واسطے اپنے پاس مظفر نگر میں مولٰنا صاحب کو رکھا، اور بہت خدمت و تیمارداری کی"

اسی زمانہ میں حکیم صاحب ممدوح مرادآبادی اپنے وطن سے حضرت والا کی عیادت کے لئے مظفر نگر ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب کے گھر پہنچے تھے، اطلاع دی ہے کہ

"قدرے افاقہ تھا، مگر اصل مرض باقی تھا، ٹھسکا اور خفیف بخار رہتا تھا" ص۱۹۰

الغرض دو سال کی اس طویل مدت میں طب یونانی، اور ڈاکٹری دونوں طریقہ ہائے علاج کی آزمائش کا موقعہ آپ کے ان جاں باز خدام کو ملا، حضرت والا نے بھی اپنے آپ کو ان لوگوں کے حوالہ کر دیا تھا، جو چاہا کھلاتے رہے، پلاتے رہے۔

نہیں کہا جا سکتا کہ دو سال کے اس طویل عرصہ میں علاج ان ہی دونوں بزرگوں یعنی حکیم مشتاق احمد صاحب اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب ہی تک محدود رہا، بلکہ مصنف امام نے اپنی کتاب میں جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"یونانی طبیبوں نے ہر قسم کا علاج کیا، ڈاکٹروں نے ہر طرح کی تدبیر کی"

(گزشتہ صفحہ سے) دوائیں لے کر دیوبند پہنچ جاتے، ضرورت محسوس ہوتی، تو اپنے ساتھ مریض کو مظفر نگر لے جاتے اور صحت کے بعد واپس کرتے۔ سیدنا الامام الکبیرؒ کی وفات کے بعد غالباً بعد حصول پنشن گنگوہ میں حضرت گنگوہی کے زیر سایہ قیام اختیار کر لیا تھا، مولٰنا نے لکھا ہے کہ بچپن میں میں گنگوہ حاضر ہوتا، تو مجھے اپنے گھر لے جاتے اور بڑی خاطر مدارات کرتے۔ ڈاکٹر صاحب کا گنگوہ میں یہ دستور تھا کہ ہر تیسرے روز پلاؤ دیگ اکر حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر کرتے۔ حضرت کچھ تناول فرما کر دوسروں میں تقسیم کر دیا کرتے، اور مولٰنا طیب صاحب جیسے پہنچتے تو یہ اُلش ان ہی کے لئے مختص ہو جاتا تھا ۱۲

ان الفاظ سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ایک ہی طبیب اور ایک ہی ڈاکٹر تک علاج محدود نہ تھا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حکیم مشتاق احمد صاحب اپنے ہم پیشہ اطبا، دیوبند و بیرون دیوبند سے بھی مشورہ لے کر علاج کرتے رہے، اسی طرح ڈاکٹر صاحب جب اپنی ذاتی تدبیروں سے تھک جاتے ہوں گے، تو دوسرے ڈاکٹروں کی آرار حاصل کرتے ہوں گے، اور بات صرف یونانی و ڈاکٹری ہی کی حد تک محدود نہ تھی، مصنف امام کے ان الفاظ کا یعنی

"ہندی ادویہ، کشتے، رس وغیرہ برتے"

مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے تیسرے طریقۂ علاج ویدک سے بھی جہاں تک استفادہ ممکن تھا، فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی، الغرض وہی بات جس کی طرف حضرت والا کے ذاتی حالات کے خاتمہ میں طبقات ابن سعد کی اس روایت کو پیش کرتے ہوئے، یعنی آخر زمانہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ بیمار ہونے لگے تو دیکھا گیا تھا کہ

کانت العرب تنعت له فيتداوى بما تنعت العرب وكانت العجم تنعت له فيتداوى	عرب کے باشندے دواؤں کی نشان دہی کرتے، آپ ان کی بتائی ہوئی دواؤں کو بھی استعمال کرتے، اور عجم (غیر عرب) کے لوگ بھی دوائیں بتاتے، توان کو بھی استعمال کرتے۔
ص۱۱۶ الجزء الاول من القسم الاول	

عرض کیا گیا تھا، کہ اختیاری اعمال و افعال میں پیروی کا جب ارادہ کیا جاتا ہے تو پیروی کرنے والوں کے سامنے اسی کا صلہ اس شکل میں بھی پیش ہوتا ہے، کہ غیر اختیاری امور میں بھی اس کو نمونہ سے حصہ دیا جاتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں، سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اس دعوے کی کیسی جیتی جاگتی تصویر ہے، صحت تو صحت، مرض

اور بیماری میں جو مستحق تھا، اس کو اپنے نمونہ سے حصہ بخشا جا رہا ہے، وہاں بھی علاج کے جن طریقوں سے عرب والے مانوس تھے اس کو بھی اختیار کیا گیا، اور عرب کے باہر عجم والوں سے اسی علاج و معالجہ کے سلسلہ میں جو مشورہ ملتا، اسے بھی قبول کیا جاتا تھا۔ یہاں بھی ملاحظہ فرمائیے، عشق و محبت کی کرشمہ سازیوں کا مطالعہ بچشم عبرت کیجئے کہ سرے سے علاج و معالجہ کی ہی جس کی نگاہوں میں چنداں اہمیت نہ تھی، اسی نے اپنی آخری علالت کے ان دنوں میں یونانی و ڈاکٹری و یدک، دیسی بدیسی الغرض علاج کے سارے مروجہ طریقوں کی آزمائش کے لئے اسی نے اپنے آپ کو تیمار داروں کے سپرد کر دیا۔ علاج کرنے والے تو سمجھ رہے تھے کہ ہم اس کا علاج کر رہے ہیں وہ شفاء کی امیدیں باندھ رہے تھے، لیکن در پردہ اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری علالت کے نمونوں میں سے جو حصہ اس کے لئے مقدر تھا آپ دیکھ رہے ہیں اسی سعادت سے بہرہ اندوزی کا موقعہ غیب سے گویا مہیا کیا جا رہا تھا۔

ذاتی حالات ہی کے سلسلہ میں اس کا ذکر بھی کر چکا ہوں، کہ علاج کے ان تمام طریقوں میں سیدنا الامام الکبیر تک جیسی اعلیٰ اور قیمتی دوائیں ہر طرف سے بہم پہنچائی جا رہی تھیں، ان کے لئے اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ مصنف امام جیسے محتاط بزرگ کے قلم سے ایسے الفاظ نکل پڑے ہیں، کہ ہم ان الفاظ کو اگر استعمال کریں تو شاعری کے سوا غالباً انہیں اور کچھ نہ سمجھا جائے۔ آخر ان کے یہ فقرے جنہیں پہلے بھی نقل کر چکا ہوں، یعنی

"وہ دوائیں مولانا کے لئے میسر ہوئیں، کہ جو امراء کو بھی شاید
بدشواری میسر آتیں"

یا اس سے بھی آگے بڑھ کر

"اور ویسا علاج ہوا کہ جو بادشاہوں کو بھی شاید ہی نصیب ہو"

یہ دوسروں سے سنی سنائی خبریں نہیں ہیں، بلکہ اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھ رہے تھے، اپنی دینی اور علمی ذمہ داریوں کے ساتھ اسی کی تعبیر مذکورہ بالا الفاظ میں وہ فرما رہے ہیں۔ اسی موقعہ پر لکھنؤ کی لکڑیوں کا وہ قصہ بھی فقیر نے یاد دلایا تھا جس کا ذکر ارواح ثلاثہ میں کیا گیا ہے، یعنی حضرت مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی مرحوم تک کسی ذریعہ سے یہ خبر پہنچی کہ سیدنا الامام الکبیر کے دل میں لکڑیوں کے کھانے کی خواہش پیدا ہوگئی ہے۔ جو دیوبند اور اطراف دیوبند میں آج کل نہیں مل رہی ہیں۔ بیان کیا گیا تھا کہ سننے کے ساتھ ہی لکھنؤ سے ایک دفعہ نہیں، بلکہ متعدد بار بذریعہ پارسل لکڑیوں کے بھجوانے کا نظم مولانا فرنگی محلی نے فرمایا، اور وہ برابر حضرت والا کی خدمت میں پہنچتی رہیں، میں نے اس وقت بھی عرض کیا تھا، کہ کسی حکمرانِ وقت، یا بادشاہ کے لئے بھی یقیناً مولانا فرنگی محلی اس زحمت کو برداشت کرنے پر شاید ہی آمادہ ہوتے۔ اسی لئے مصنف امام نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے، کم از کم مجھے تو اس پر تعجب نہیں ہوتا۔

مگر یہ سب کچھ ہوتا رہا، عرب و عجم یا دیسی بدیسی علاج و معالجہ کے ہر طریقہ کا ممکنہ وسیع سے وسیع پیمانہ پر انتظام کرنے والے کرتے رہے، سچ تو یہ ہے کہ اپنے خون، اور شاید ان عاشقان صادق کی جان کی بھی ضرورت ہوتی، تو اس کے پیش کرنے میں غالباً وہ پس و پیش نہ کرتے[1]۔ مگر بقول مصنف امام

> "مرض رفع نہ ہوا، دو برس اسی کیفیت پر گذر گئے، کہ گاہ کچھ صورت تخفیف کی ہو کر قدرے طاقت آئی، اور پھر دورہ سانس کا ہوا، اور وہی صورت ضعف کی ہو گئی" ص۲۴

[1] آگے اس کا ذکر کیا بھی جائے گا کہ ظاہری اسباب سے مایوسی کے بعد ہمارے مصنف امام مولانا محمد یعقوب صاحب ہی نے دربار الٰہی میں یہ درخواست پیش کی تھی کہ میری بقیہ عمر جتنی مدت باقی ہے، وہ مولانا کو عطا فرما دی جائے، جان کے پیش کرنے کے سوا آپ ہی بتائیے کہ اسے اور کیا سمجھنا چاہیئے ۱۲

تاہم ان تجربوں کے بعد بھی مصنف امام کو نہ خود اپنا اشراقی احساس ہی یاد آرہا تھا، اور رخصت کرتے ہوئے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ فرمایا تھا اس کا جو واقعی مطلب تھا، نہ اسی کی طرف ان کا ذہن منتقل ہوا، دوا و تدبیر کی بے اثری کے مسلسل مشاہدوں نے آخر میں جس کیفیت کو ان کے قلب میں پیدا کیا تھا، اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"ہر چند صحت اور نجات کی امید پوری نہ تھی"

گویا پہلے جو ان کا خیال تھا کہ جس طرح پہلے بھی خطرناک طور پر علیل ہو جانے کے بعد سیدنا الامام الکبیر شفایاب ہو چکے ہیں، اب کی بار بھی یہی صورت انشاء اللہ پیش آئے گی، اس خیال میں گو نہ تبدیلی پیدا ہوئی، شفا کی کامل توقع کی جگہ کچھ کچھ ناامیدی کی بھی جھلک محسوس ہونے لگی، مگر پوری امید نہ سہی، کچھ نہ کچھ امید صحت کی اب بھی باقی ہی تھی۔

سچ تو یہ ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کا جمال جہاں آرا جن لوگوں کی "جنت نگاہ" اور آپ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والا ایک ایک فقرہ "فردوس گوش" بن جاتا ہو، انصاف کی بات یہی ہے، اپنے سامنے سے نگاہ کی اس جنت، اور گوش کے اس فردوس کے ہٹ جانے کا تصور بھی جن لوگوں کے لئے ناقابل برداشت تھا، وہی قطعی طور پر اپنے آپ کو ناامیدی پر آخر کیسے راضی کر سکتے تھے۔ البتہ رجاء کے ساتھ اب کچھ کچھ خوف، امید کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی "دہشت" کے جھونکے بھی ان کے قلوب پر گذر جاتے تھے، اور وہ چاہتے تھے کہ بجائے ٹھیرنے کے وہ گذر ہی جائیں لیکن دن گذرتے جاتے تھے، اور واقعات ناامیدی ہی کے پلّے کو زیادہ جھکاتے چلے جاتے تھے، شہادت اور عالم محسوس ہی میں نہیں، بلکہ غیب کے نامحسوس دوائر تک سے اشارہ پانے والوں کو اس قسم کے اشارے جب ملنے لگے، مثلاً کہا جاتا ہے،

مولٰنا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"حافظ بہادر دیوبندی نے دو ماہ پیش تراز وفات خواب دیکھا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے دایاں ہاتھ حافظ بہادر کے سر پر رکھا اور بائیں ہاتھ سے بہت زور سے اپنی دائیں پسلی کو پکڑا، حافظ بہادر نے عرض کیا کہ حضرت آپ نے پسلی کیوں پکڑی، فرمایا میری پسلی میں شدت سے درد ہے۔"

حافظ بہادر کی آنکھ اس کے بعد کھل گئی، خواب سے وہ غیر معمولی طور پر متاثر تھے، سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہو کر جو کچھ خواب میں دیکھا تھا، بیان کیا، مولٰنا طیب صاحب نے ارقام فرمایا ہے کہ خواب کو سننے کے بعد اسی کی تعبیر کے متعلق اس اصولی مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے کہ

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دائیں پسلی سے مراد علماء باعمل ہیں، اور بائیں پسلی سے مراد فقراء۔"

خواب کی تعبیر یہ دی گئی کہ

"معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں میں کسی بڑے عالم کا انتقال ہوگا۔"

اہل مجلس جو بیٹھے ہوئے تھے سب ہی نے یہ تعبیر سنی۔ لیکن تعبیر دینے والا ہی خود اس خواب کی تعبیر ہے، بھلا اس کی طرف اپنے ذہن کو منتقل ہونے کی کون اجازت دے سکتا تھا؟

حالت تو یہ تھی، خواب ہی کا ایک قصہ ہمارے میر شاہ خاں مرحوم بیان کرتے تھے یہ رؤیا خود ان ہی کی تھی، خاں صاحب مرحوم کو حضرت والا کی ذات مبارک سے جو والہانہ عقیدت تھی، جو اس سے واقف ہیں، غالباً ان کے اس خواب پر انھیں تعجب نہ ہوگا، کہتے تھے کہ اسی زمانہ میں جب حضرت والا کی علالت خطرناک صورت اختیار

کر چکی تھی ۔

"میں نے دیکھا کہ کوئی صاحب جو اپنی ظاہری شکل و صورت سے معلوم ہوتے تھے کہ اہل اللہ کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، میں نے ان کو دیکھ کر عرض کیا کہ ہمارے مولٰنا محمد قاسم صاحب کو اس شدت کی تکلیف مرض کی کیوں ہو رہی ہے، انہوں نے تین مرتبہ فرمایا کہ کیا مولوی محمد قاسم صاحب کے مثل کوئی دوسرا شخص بھی ہے؟"

پھر خود جواب دیا کہ "نہیں ہے"

میر شاہ صاحب فرماتے تھے کہ

"میں نے خواب ہی میں ان بزرگ سے عرض کیا کہ اسی وجہ سے تو میں بھی عرض کرتا ہوں کہ باوجودیکہ مولٰنا بے مثل ہیں، پھر ان کو تکلیف کیوں ہے؟"

بزرگ صاحب نے خاں صاحب کو جواب دیا کہ

"مولٰنا کو کچھ تکلیف نہیں ہے، اور نہ کوئی مرض ہے"

اسی کے ساتھ خواب ہی میں خان صاحب کو ان ہی بزرگ صاحب نے مطلع کیا کہ

"ایک بہت بڑا معاملہ درپیش ہے، اور اسی کی وجہ سے ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ مولٰنا بیمار ہیں"

خان صاحب کہتے تھے کہ میں نے تب دریافت کیا، "معاملہ کیا ہے؟ جواب میں ان سے کہا گیا کہ

"مولٰنا نے جناب باری میں یہ درخواست پیش کی ہے، مجھ کو جو حضور نے طلب فرمایا ہے، تو میں بخوشی حاضر ہوں، مگر میری ایک عرض

ہے کہ جس خدمت پر یہ بندہ دنیا میں مامور کیا گیا تھا، اس خدمت
پر بندہ کے روبرو دوسرے شخص کو مقرر فرما دیا جائے"

بزرگ صاحب نے کہا کہ بارگاہ الٰہی سے مولٰنا کی اس عرضداشت کا
"جواب اب تک نہیں حاصل ہوا ہے"

مولٰنا طیب صاحب نے "مہامی یادداشت" میں خاں صاحب مرحوم کی اس رؤیاء کا ذکر کیا ہے، تعبیر تو اس خواب کی جو کچھ بھی ہو، لیکن "وابستگان دامن قاسمی کے نفسیات" کی بھی غمازی جہاں تک میرا خیال ہے، یہ خواب کر رہا ہے۔ بزرگ صاحب سے خاں صاحب یہ نہیں پوچھتے کہ اس مرض کا انجام کیا ہوگا۔؟

حضرت والا کی تکلیف کی وجہ سے جھنجلاہٹ کی جو کیفیت ان کے دل میں پائی جاتی تھی، اسی کے زیر اثر دریافت کرتے ہیں تو صرف یہی دریافت کرتے ہیں کہ ہمارے حضرت کو اتنی تکلیف کیوں ہے؟ اور کیا تعجب ہے، کہ آخر میں بزرگ صاحب نے جو یہ خبر خاں صاحب کو خواب میں دی کہ مولٰنا کی عرضداشت کا جواب بارگاہ الٰہی سے ابھی تک حاصل نہیں ہوا ہے خواب کے اس آخری جزء سے بیداری میں خان صاحب نے یہ امید قائم کر لی ہو، کہ طلبی کے مطابق روانگی کا وقت ابھی قریب نہیں ہے، کم از کم جواب آنے تک تو تاخیر کا موقعہ ان کے ذہن نے ڈھونڈھ ہی لیا ہوگا۔

مگر وقت جلد جلد گزر رہا تھا، اور قرآن کا "کتاب مؤجّل" (موقت نوشتہ) اسی کے گذرنے کے ساتھ قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ وداعی حج سے واپسی پر دو سال کی مدت بھی گذر چکی تھی،

اسی عرصہ میں سہارنپور سے خبر آئی، ناشر کتب الاثار والحدیث مصحح و محشی صحیح بخاری حضرت مولٰنا احمد علی صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ پر فالج کا دورہ پڑ گیا ہے، حضرت

سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ سے گذر چکا کہ سیدنا الامام الکبیر صرف تلمذ ہی کا تعلق نہیں رکھتے تھے، بلکہ حدیث کی کتابوں کی خدمت میں مدت تک ان کے رفیق کار بھی رہ چکے تھے، بخاری شریف کے آخری حصہ کے تحشیہ کا کام حضرت مولنٰا سہارنپوری کے حکم سے حضرت والا نے انجام دیا تھا، ان ہی گوناگوں تعلقات، اور قلبی ارتباط کا نتیجہ یہ ہوا، کہ باوجود علالت کے مولنٰا احمد علی صاحب کی عیادت کے لئے سہارنپور جانے پر سیدنا الامام الکبیر مصر ہوئے، اصرار اتنا زیادہ تھا کہ تیمارداروں کو بھی راضی ہونا پڑا۔ مصنف امام نے لکھا ہے، کہ مولنٰا احمد علی صاحب کی عیادت کے لئے

"سہارنپور تشریف لے گئے"

یہ خبر بھی انہوں نے دی ہے، کہ مولنٰا احمد علی صاحب کو دیکھنے، اور ان کے علاج کے لئے

"ڈاکٹر، حافظ عبدالرحمٰن صاحب کو مظفر نگر سے بلایا تھا"

گویا ڈاکٹر صاحب تو مظفر نگر سے ریل پر سوار ہوئے، اور دیوبند کے اسٹیشن سے حضرت والا ان کے ہمراہ سہارنپور تشریف لے گئے، لیکن معلوم ہوتا ہے، کہ لوگوں کے سمجھانے بجھانے یا خود مولنٰا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اصرار پر سہارنپور میں زیادہ قیام نہ فرما سکے، بلکہ بقول مصنف امام

"اسی روز گئے، اور شام کو واپس ریل میں آئے"

ایک صحت مند، تندرست آدمی کے لئے تو دیوبند سے سہارنپور، اور سہارنپور سے اسی دن دیوبند واپس ہو جانے میں تو کسی زحمت کا اندیشہ نہیں ہو سکتا، لیکن حضرت والا جس حال میں گئے، اور آئے، اسکا جو نتیجہ ہو سکتا تھا، وہی ہوا، مصنف امام نے خبر دی ہے، کہ دیوبند واپس ہونے کے بعد

"تکان کے سبب طبیعت علیل ہو گئی"

علیل تو تھے ہی، بظاہر مراد ان کی یہ ہے، کہ تکان کی وجہ سے طبیعت زیادہ بگڑ گئی، یوں بھی آپ سوچئے، دیوبند کا اسٹیشن بھی قصبہ سے کافی فاصلہ پر ہے، اور یہی حال سہارنپور کے شہر کا اسٹیشن سے ہے۔ صبح کو دونوں مقامات کے ان فاصلوں کو طے کر کے شام کو اسی راستہ سے واپسی سواری ہی پر کیوں نہ ہو، ایک ایسے شخص کے لئے جو مہینوں سے بیمار ہو، جس حد تک تعب اور تکان کا سبب ہو سکتی ہے، ظاہر ہے، حسب دستور پھر کچھ تدبیریں کی گئیں، گو نہ طبیعت بظاہر پھر کچھ بحال ہو گئی، حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کی عیادت اس روا روی کے ساتھ کہ اسی دن گئے، اور واپس آ گئے، سیدنا الامام الکبیر کے جی کو لگی ہوئی تھی، معمولی افاقہ جوں ہی کہ آپ کو کچھ محسوس ہوا، پھر حضرت سہارنپوری کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے تڑپنے لگے، بقول مصنف امام

"پھر اسی عرصہ میں سہارنپور کا قصد کیا

اور اسی قصد کے مطابق عمل کا عزم بالجزم بھی فرما لیا گیا، جس میں مزاحمت کی ہمت کوئی نہ کر سکا، سہارنپور پہنچنے کے بعد دیکھا گیا کہ فالج کے آثار میں بہت کچھ تخفیف ہو چکی ہے یعنی مصنف امام کے الفاظ میں

"جناب مولوی احمد علی صاحبؒ کو تخفیف اصل مرض (فالج) میں ہو گئی تھی، مگر بخار اور ضعف شدید تھا"

پہلی دفعہ جب حاضری ہوئی تھی، فالج کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ مولانا احمد علی صاحب اپنے دل کی آرزو ظاہر نہ کر سکے، لیکن اب کی دفعہ فالج کے آثار گھٹ چکے تھے، بول چال کی قدرت پیدا ہو چکی تھی، واللہ اعلم دونوں میں کیا راز تھا؟ استاد نے شاگرد سے کچھ کہا، اور باوجود خود بیمار ہونے کے سیدنا الامام الکبیر نے سر تسلیم خم کر دیا، مولانا احمد علی صاحبؒ کی طرف سے فرمائش ہوئی، کہ کچھ دن میرے پاس ٹھیرو،

حضرت والا ٹھیر گئے، یہی مطلب ہے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"مولوی صاحب (یعنی مولانا احمد علی صاحب) ٹھیرنے کے باعث ہوئے"

یا تو پہلی دفعہ کی عیادت میں اسی دن واپسی ہوگئی، اور اب سنئے راز و نیاز کی ان باتوں کو کون جانے مصنف امام نے اطلاع دی، ہے کہ ٹھیرنے کی خواہش مولانا احمد علی صاحبؒ کی طرف سے جو پیش ہوئی، تو

"دو ہفتہ وہاں قیام فرمایا"

یہ بھی انہیں نے لکھا ہے کہ

"اتنا قیام خلاف عادت تھا"

جو کچھ ہونے والا تھا، اسے کون روک سکتا تھا، لیکن ظاہر اسباب کی رو سے کہا جا سکتا ہے کہ جس قسم کی دیکھ بھال، احتیاط اور تدبیر کی آسانیاں مستقر دیوبند میں میسر تھیں، ان کا سفر کی حالت میں مہیا ہونا ظاہر ہے کہ سہل نہ تھا، خواب و خور، نشست و برخاست کی پابندیوں کا نباہنا، یوں ہی اس قسم کے موقعوں پر آسان نہیں ہوتا، اور حضرت والا کی طبیعت کا جو رنگ تھا، آنے جانے والوں کی خاطر سے اشراق و چاشت کی نمازوں سے جو دست بردار ہو جاتا ہو، سمجھا جا سکتا ہے کہ سہارنپور کے رہنے والوں میں ایک دو دن نہیں دو ہفتے ٹھیرنے کا مغتنم موقعہ جب مل گیا تھا، تو لوگوں نے جیسا کہ دستور ہے، آپ کے ساتھ کیا رعایت کی ہوگی، اسی قسم کی بے احتیاطیوں کا نتیجہ جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے، بظاہر یہ ہوا کہ

"وہاں دورہ ہوا"

دورے سے غالباً مراد وہی سانس کا دورہ معلوم ہوتا ہے، معمولی بے احتیاطی

سے جو ابھر آتا ہے، اور یہ دورہ تو خیر معمولی تھا، جس کے حضرت والا گویا عادی ہی ہو چکے تھے، لیکن سہارنپور کے اس دورے کے ساتھ مصنف امام نے اطلاع دی ہے کہ

"ساتھ ہی اس کے ذات الجنب بھی ہوا"

مزمن مرض کے ایک مریض پر ذات الجنب کا حملہ؟ اس کی نزاکت کا بھلا کون اندازہ کر سکتا ہے، اب ایک طرف حضرت مولٰنا احمد علی صاحبؒ اپنے بستر علالت پر فریش تھے، اور دوسری طرف ان کے تلمیذ سعید قدیم رفیق کار اپنے بالین علالت پر ذات الجنب کی تکلیف میں تلملا رہے تھے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"یہاں (دیوبند) دوسرے دن خبر ہوئی"

سناٹا چھا گیا۔ ان ہی کا بیان ہے کہ

"اسی روز حافظ انوار الحق صاحب روانہ ہوئے، اور صبح کو مولوی صاحب کو (یعنی سیدنا الامام الکبیر کو) ریل میں لے آئے"

جس حال میں دیوبند واپسی ہوئی تھی، مصنف امام نے اس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے

"مگر کیا آئے، کہ سانس نہ آتی تھی"

گویا بالا دمی کی سی ایک کیفیت پیدا ہو گئی، وداعی حج سے واپسی پر دو سال گذر جانے کے بعد تقریباً دو مہینے ربیع الاول اور ربیع الثانی کے گذر چکے تھے، یا شاید ربیع الثانی کی آخری تاریخیں ہوں، جب سہارنپور سے ذات الجنب کے حملہ کے بعد آپ دیوبند لائے گئے، صحیح تاریخ کا تو پتہ نہ چل سکا، بظاہر ایک ہفتہ کا وقفہ درمیان میں اور گذرا، وقفہ کے اسی زمانہ میں جو ممکنہ تدبیریں

تھیں بکرنے والے انہیں اختیار کرتے رہے، ان ہی تدبیروں میں پہلی تدبیر ذات الجنب کے لئے جیساکہ مصنف امام نے لکھا ہے یہ کی گئی کہ

"فصد لی"

یوں فصد دے کر کچھ خون نکالا گیا، ان ہی کا بیان ہے، یہ فوری تدبیر وقتی طور پر کچھ کارگر بھی ثابت ہوئی، یعنی بقول ان ہی کے

"درد موقوف ہوا"

مگر درد میں یہ سکون بھی وقتی سکون ثابت ہوا۔

"پھر کچھ درد کا اثر معلوم ہوا"

فصد کے بعد دوسری تدبیر خون ہی کے نکالنے کی یہ کی گئی کہ

"جونک لگائی"

لکھا ہے کہ اس کے بعد

"دو تین دن طبیعت صاف رہی"

بظاہر درد کی تکلیف کا اعادہ شاید ان دو تین دنوں میں نہیں ہوا، دیوبند قصبہ تھا، بعض دواؤں کی ضرورت تھی جو وہاں نہ مل سکیں، آدمی دلی دوڑایا گیا، جو اپنے ساتھ دوائیں لے کر دیوبند پہنچا، یہ دوائیں استعمال کرائی گئیں، دلی کی ان دواؤں کے استعمال سے جو غرض تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"دلی سے کچھ دوائیں مقوی آئی تھیں، ان کا استعمال ہوا، ضعف نہایت تھا، بات کرنی دشوار تھی"

گویا اسی ضعف کا ازالہ ان مقوی دواؤں سے مقصود تھا، مگر بقول ان ہی کے۔

"اس میں (یعنی ان مقوی دواؤں کے استعمال کرنے میں) حرارت کو شدت ہوگئی"

یہی حرارت بڑھی، اور بڑھ کر اس درجہ تک پہنچی، کہ شدّت حرارت کی وجہ سے بقول ان ہی کے

"کبھی کبھی غفلت ہو جاتی تھی"

پہلے تو صرف ضعف تھا، کہ بات کرنا چاہتے تھے، لیکن شدت ضعف کی وجہ سے کر نہیں پاتے تھے، اب مزید غفلت کا اضافہ حرارت کے بڑھ جانے کی وجہ سے ہو گیا، غفلت کی اس حالت کو دیکھ کر مصنف امام ہی نے لکھا ہے کہ

"ایک ملیّن دیا"

لیکن جب اس کا اثر ظاہر نہ ہوا، تو وہی خبر دیتے ہیں کہ

"رائے ہوئی کہ پھر ملیّن دیا جائے"

جو دیا گیا، اور اس کا اثر بھی نمایاں ہوا، ان ہی کا بیان ہے کہ

"دو دست ہوئے"

یہ تو ملین دینے کا اثر تھا، لیکن دست آجانے کی وجہ سے لکھا ہے،

"غفلت کو شدت ہو گئی"

مصنف امام کا بیان ہے کہ

"یہ منگل کا دن تھا"

غفلت کی شدّت لمحہ لمحہ سے بڑھتی ہی چلی جاتی تھی، تاہم وہی لکھتے ہیں کہ

"ظہر کے وقت تک جواب دیتے تھے، مگر ہوش نہ تھا"

"ہوش نہ تھا" ظاہر ہے کہ "غفلت" ہی کے لفظ کی یہ شرح ہے، لیکن پوچھنے والوں کو چونکہ جواب کچھ نہ کچھ مل رہا تھا، اس لئے سمجھا گیا کہ یہ غفلت اور بیہوشی ابھی حد سے نہیں گذری ہے، مگر جب ظہر کی نماز کا وقت آگیا، اور وہی جس کی ساری زندگی ہی کسی کے قدموں پر سر رگڑنے میں بسر ہوئی تھی، "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ" کی آواز پر

دیکھنے والوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ حالت بدل نہ گئی ہو، لیٹے ہوئے ہوتے تو اٹھ بیٹھتے اور بیٹھے ہوتے، تو کھڑے ہو جاتے، کھڑے ہوتے تو چل پڑتے، جہاز میں جس وقت تے پر تے کے مسلسل دورے پڑ رہے تھے، ابھی کچھ دیر پہلے سن چکے کہ "نماز کے وقت ہر چیز سے بے پروا ہو کر جس طرح ممکن تھا، اسے ادا کرتے" لیکن آہ! کہ آج اسی کو پکارنے والے پکار رہے ہیں، یاد دلا رہے ہیں، کہ ظہر کی نماز کا وقت ہے۔ مصنف امام موجود تھے، لکھتے ہیں کہ

"نماز کے لئے کہا، تو سوائے "اچھا" کے اور کچھ نہ کر سکے، نہ تیمم کی طرف توجہ ہوئی، نہ نماز کی طرف"۔

تب سمجھا گیا کہ غفلت اپنے آخری حدود سے گذر چکی ہے۔ تکلیفی ہوش و حواس سب غائب ہو چکے ہیں، وقتی نمازوں کا پڑھنے والا اب ع

عاشقاں ھو فی صلاۃ دائمون

کے حال میں غرق ہے، رحمۃ اللہ علیہ۔

مصنف امام جو صحت کی پوری امید سے دست بردار ہونے کے بعد اس وقت تک کچھ نہ کچھ آس لگائے ہوئے تھے۔ نماز کی طرف سے بھی بیہوشی اور غفلت کی اس حالت میں بے توجہی دیکھ کر کتاب میں تو یہی لکھا ہے، کہ

"تب ایک صورت یاس کی ہوئی"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ "کامل یاس" کے تصور سے اب بھی اپنے آپ کو وہ معذور ہی پا رہے تھے، بجائے "کامل یاس" کے اس حال کو بھی وہ یاس کی ایک صورت ہی قرار دیتے رہے۔

منگل کا دن جس وقت ختم ہو رہا تھا، تو ان ہی کی یہ اطلاع ہے، کہ پوچھنے والوں کو کچھ جواب جو مل جاتا تھا،

"وہ جواب بھی موقوف ہوگیا"

اللہ اللہ میرا قلم جب کانپ رہا ہے، انگلیاں تھرا رہی ہیں، خدا ہی جانتا ہے کہ مصنف امام کا اس وقت کیا حال ہوگا، جب کاغذ ان الفاظ سے سیاہ ہو رہا تھا۔

"ایک تشنج کی آمد شروع ہوئی، اس کو نزع سمجھا، اور یوں جانا کہ اب وقت آخر ہے"

مگر جیسا کہ ان ہی کا بیان ہے کہ اس کیفیت میں ذرا طوالت پیدا ہوگئی، منگل کا دن ختم ہو کر بدھ کی رات داخل ہو چکی تھی، وہی لکھتے ہیں کہ

"وہ رات اور دن، اور اگلی رات، اور دوپہر جمعرات کی اسی کیفیت پر گذری"

گویا بدھ کی رات کے ساتھ اس کا دن بھی، اور دن کے بعد جمعرات کی شب، کے بعد دوپہر تک جمعرات کا دن بھی اسی کیفیت میں گذرا۔

عالم محسوس اور شہادت میں رہنے والوں کے سامنے تو یہ جگر خراش، اور روح گداز فاجعہ پیش تھا، لیکن غیب میں کیا ہو رہا تھا، ان ہی چند دنوں، یا ان سے ایک دو دن پہلے بعضوں پر کبھی کبھی بحالت خواب کوئی تجلی اس کی پڑ جاتی تھی، سیدنا الامام الکبیر کے خادم خاص حاجی محمد یٰسین دیوبندی جن کا ذکر متعدد حیثیتوں سے گذر چکا ہے، مولٰنا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ ان ہی حاجی محمد یٰسین صاحب کو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے سرفرازی ہوئی، حاجی صاحب پر ظاہر کیا گیا کہ

"واسطے عیادت مولانا مرحوم کے تشریف لائے ہیں"

اسی طرح دارالعلوم کے ایک طالب علم مولوی احمد اللہ نامی جو نجیب آباد کے رہنے والے تھے، انہوں نے تو جمعرات ہی کے دن چند گھنٹہ پہلے خواب میں دیکھا،

مدرسہ کے احاطہ میں ایک مکلف مکان ہے، جس کے اندر
ایک مرصع کرسی بچھی ہوئی ہے، اس پر سرور کائنات خاتم المرسلین
رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ فرما ہیں، اور آپ کے ارد گرد
آپ کے خلفاء اربعہ راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کھڑے ہیں۔
دوسری طرف ایک پرا ان کو فرشتوں کا بھی نظر آیا، مولوی احمد اللہ
نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا، کہ
کیسے تشریف آوری ہوئی، جواب میں ارشاد ہوا کہ

"مولوی محمد قاسم صاحب کو لینے آیا ہوں"

مولوی احمد اللہ کا بیان ہے کہ

"سامنے ایک پلنگ پر سوار دیکھا کہ مولانا آئے"

اس کے بعد مولوی احمد اللہ صاحب کو جو کچھ دکھایا گیا، ان ہی کے الفاظ میں سنئے،
کہتے تھے، میں نے دیکھا

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مولانا کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے
فرما رہے ہیں

اے حبیب آنے میں کیا دیر ہے"

مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ نزع کی کش مکش کے اختتام سے
دو گھنٹے پہلے کہتے ہیں، کہ مولوی احمد اللہ صاحب کو یہ رؤیا ہوئی تھی، اللہ اللہ
فداہ ابی و امی ؎

بجز نازرفتہ باشد ز جہاں نیاز مندے
کہ بجان سپردن او بہ تن رسیدہ باشی

اور یہ مکاشفات یا منامی مبشرات تو ان لوگوں کے تھے، جو غیبی تجلیات سے اثر پذیری

اور عکس گیسوی کی فطری مناسبتوں، جبلّی صلاحیتوں سے سرفراز تھے، وہ تو جو دیکھ رہے تھے، یا ان کو جو کچھ دکھایا جا رہا تھا، اسے تو چھوڑیئے، میں تو پوچھتا ہوں، کہ اسی عالم محسوس یا دائرۂ شہادت کے مشاہدات، یعنی غشی کا طاری ہونا، دو راتیں اور تقریبًا ڈیڑھ دن تک تشنج کی اسی کیفیت کا تسلسل جسے مصنف امام بھی "نزع" ہی کی کیفیت سمجھتے رہے، ان کو بھی باور ہی کرنا پڑا کہ یہ "وقت آخر" ہے۔ سوال یہی ہے، کہ جن کے حافظہ میں بخاری شریف کی روایت کا جزء

غشی علیہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وفات سے پہلے غشی طاری ہو گئی تھی،

محفوظ ہوگا۔ اور اسی کتاب کی مشہور حدیث کا فقرۂ نبویہ

لا الٰہ الا اللہ ان للموت لسکرات	لا الٰہ الا اللہ موت میں سکرات کی کیفیتیں ہیں۔

لے موت کے وقت کی یہ کیفیت جس کی تعبیر قرآن میں بھی سکرۃ الموت کے لفظ سے کی گئی ہے، مرنے والوں پر اس وقت کیا گذرتی ہے، عام خیال تو وہی ہے جس کی تائید حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالٰی عنہا کے قول سے بظاہر ہوتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ بعض علماء مثلاً زرقانی نے شیخ ابو محمد فرجانی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ تلك السكرات سكرات الطرب یعنی مسرت اور نشاط کی شدت سے سکرات کی یہ حالت طاری ہوتی ہے، ان کا خیال ہے کہ عربی زبان میں سکرہ کے معنی تکلیف یا دکھ کے نہیں ہیں۔ بلکہ نشہ کی حالت کو سکرہ کہتے ہیں۔ علامہ فرجانی اپنے قول کی تائید میں یہ بھی فرماتے تھے کہ وفات کے وقت حضرت بلال رضی اللہ تعالٰی عنہ کی زبان مبارک سے سننے والے یہ سن رہے تھے کہ واطرباہ (میری مسرت کا کوئی ٹھکانہ ہے) اور یہ شعر پڑھتے۔ غدا نلقی الاحبہ۔ محمدا وحزبہ (یعنی کل ہم اپنے دوستوں سے ملیں گے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کے جتھہ سے) بہر حال اگر سکرات میں تکلیف ہی کا کوئی پہلو ہوتا ہے، جسے مرنے والوں کے سوا دوسرے جان نہیں سکتے، تو پھر یہی سمجھنا چاہیئے کہ تزکیہ و تطہیر کا رفع مراتب کے لئے نیک بندوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا جاتا ہے، ان ہی روایتوں میں جن میں ہر مصیبت اور غم کو مومن کی تطہیر اور پاکی کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، ان ہی میں ایک روایت یہ بھی ہے۔

المؤمن یوجر فی کل شئی حتی الغط فی الموت (تفسیر درمنثور ص۲۲۷ ج ۱۲)	مومن کے لئے ہر بات میں اجر و ثواب ہے، یہاں تک کہ موت کی گھٹن میں بھی۔

کے ساتھ صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قول

لا اکرہ شدت الموت لاحد بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم	موت کے وقت کی سختی کو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ناپسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتی،

جن کو اس موقعہ پر یاد آگیا، اور چاہیئے کہ یاد آجائے، کیا ان روحانی پرچھائیوں کو اپنے سامنے سے وہ ہٹا سکتے ہیں، جنھیں دیکھ کر بے ساختہ مؤمن اللّٰھم صلّ وسلّم علی حبیبك النبی الامی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم وبارك کے پڑھنے پر مضطر و مجبور ہو جاتا ہے۔

اور یہی کیا سچ تو یہ ہے کہ ٹھیک ان ہی نازک گھڑیوں میں جب دوسرے تو دوسرے خود ہمارے مصنف امام مولٰنا محمد یعقوب صاحب تک کا یہ فیصلہ جسے نقل کر چکا ہوں یعنی

"اب آخر وقت ہے"

لیکن بایں ہمہ باوجود صدیقی ہونے کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر اچانک فاروقی نسبت پرتو فگن ہے، اور چھپے دبے لفظوں میں نہیں بلکہ بھری مجلسوں میں دیکھا گیا کہ وہ اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ

"گھبراؤ مت! ابھی دس برس مولٰنا اور زندہ رہیں گے"

قصص الاکابر

حضرت حکیم الامت تھانوی رح اس کے راوی ہیں، ان ہی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں، براہ راست اس قصّہ کو خود مصنف امام سے حضرت تھانوی نے سنا تھا، فرماتے تھے کہ

"جب مولٰنا (محمد قاسم صاحب) کی شدّت مرض سے زندگی

سے مایوسی ہوئی، تو مولٰنا محمد یعقوب صاحبؒ (ہمارے مصنف امام) رجوع الی اللہ ہوئے، اور براہ ناز اس طرح دعاء کی کہ ہماری عمر انہیں عطا فرما دی جائے ۔۔

ــــــــــــــــــــــــــــــــــــــ

لہ واقعہ یہ ہے کسی موقعہ پر ذکر کر چکا ہوں کہ مولٰنا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کا حال جہاں صبر و تمکین میں یہ تھا کہ چودہ چودہ جنازے ان کے گھر سے، دیوبند میں وبا پھیل جانے کی وجہ سے ہفتہ دو ہفتے میں پیاپے نکلے جن میں خود ان کی اولاد کی بھی کافی تعداد تھی، لیکن زبان سے سرِ مو بے صبری کا کوئی کلمہ ہی نکلا، اور نہ بے قراری ان کے کسی طرزِ عمل سے ظاہر ہوئی۔ لیکن ماایں ہمہ ان میں ایک دوسرا پہلو بھی تھا، جسے چاہیں تو ہم جذب و سرمستی کی کیفیت کہہ سکتے ہیں۔ آج سے تقریباً ۳۰ سال پہلے سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی سیرت طیبہ میں اس دعوے کو پیش کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کے مجاذیبؒ بہالیل طبقہ کے سرگردہ صحابہ کرام میں حضرت ابوذر غفاری کی ذات مبارک نظر آتی ہے، فقیر نے مولٰنا محمد یعقوب صاحب کے بھی بعض واقعات و حالات کی طرف اسی موقعہ پر اشارہ کیا تھا، اس وقت تک حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے نہ خاکسار ہی کو نیاز حاصل کرنے کا موقعہ ملا تھا، اور مجھ جیسے نارسا طالب العلم کے حال سے حضرت والا کے واقف ہونے کی کوئی صورت ہی نہ تھی لیکن تحریر کا یہی حصہ القاسم دار العلوم کے مجلہ میں جب شائع ہوا، اور حضرت تھانوی کی اس پر نظر پڑی، تو اسی وقت مولٰنا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم سابق مہتمم دار العلوم کے نام ایک خط لکھا گیا، جس میں ایک مکتوب خاص فقیر کے نام بھی تھا۔ "سید الکاتبین احسن اللہ مناظرہ" کے خطاب سے مخاطب کرتے ہوئے شاباشی دی گئی اور ارقام فرمایا گیا تھا کہ مضمون نگار اگر محقق ہو چکے ہیں، تو یہ مضمون ان کی محققیت کی دلیل ہے، ورنہ "محققیت متوقعہ" کی اُمید تو بہر حال ہے۔ بہر حال حضرت مولٰنا محمد یعقوب صاحب کی جذبی کیفیت کی بھی اس گرامی نامہ میں توثیق کی گئی تھی، اسی کتاب میں کسی موقعہ پر یہ بھی گذر چکا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر سے مولانا محمد یعقوب صاحب کے کسی قول کا ذکر کسی نے کیا، تو آپ اٹھ بیٹھے، اور فرمایا کہ وہی ایسی باتیں کر سکتے ہیں ہم جیسوں کے تو فوراً کان پکڑ لئے جائیں (او کما قال) حضرت تھانویؒ نے "براہ ناز" سے ان کی لاہوتی زندگی کے اسی پہلو کی طرف شاید اشارہ فرمایا ہوگا، ہو سکتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نسماتی وجود کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے غیب کے کسی عالم میں پیش ہوئے، تو ان کے غیر معمولی حسن سے متاثر ہو کر حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ اور عمر ان کی کیا ہے؟ نام کے ساتھ بتایا گیا کہ ساٹھ سال عمر ان کی ہوگی حضرت آدمؑ نے فرمایا زدہ من عمری اربعین سنۃ (باقی اگلے صفحہ پر)

آگے اسی روایت میں ہے، کہ مولٰنا محمد یعقوب صاحب اپنی دعاء کے بعد کہتے تھے کہ "میری تسلی کی گئی، کہ ابھی دس سال مولٰنا اور زندہ رہیں گے"۔

خود سوچئے کہ دار العلوم دیوبند کے صدر اول مولٰنا محمد یعقوب صاحب کی طرف سے یہ اعلان جس وقت کیا جارہا ہوگا، اس وقت کے سماں کو یاد کرکے اپنے ذہن کو کون روک سکتا ہے، اگر اس کے آگے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے کا وہ نظارہ پیش ہوجائے کہ

سل عمر بن الخطاب سیفہ وتوعد بالقتل من یقول مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ [1]	کھینچ لی عمرؓ بن الخطاب نے تلوار اور قتل کی دھمکی ہر اس شخص کو دینے لگے، جو یہ بولے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔

(گذشتہ صفحہ سے، یعنی اے پروردگار میری عمر سے چالیس سال ان کو دے دئیے جائیں) یہ حدیث ترمذی وغیرہ کی ہے۔ ممکن ہے کہ مصنف امام کے سامنے کچھ اسی قسم کی چیزیں ہوں ۱۲

[1] یہ عجیب بات ہے کہ مولٰنا محمد یعقوب صاحب بھی یہی فرماتے تھے، جیساکہ حضرت مولانا تھانوی رح ان ہی سے سن کر نقل کیا کرتے تھے کہ دعاء کرنے کے بعد ان کو "مھدی" کے لفظ کا القاء ہوا، فرماتے تھے کہ میں نے مہدی کے اعداد جو نکالے تو میزان (۵۹) آئی، مولٰنا محمد قاسم صاحب کی عمر اس وقت (۴۹) سال تھی، میں سمجھا کہ (۵۹) سال آپ کی عمر ہوگی اسی لئے اعلان کردیا کہ دس سال ابھی اور زندہ رہیں گے۔ لیکن جب ۴۹ سال ہی کی عمر میں وفات ہوئی، تب محسوس ہوا کہ القاء کے سمجھنے میں مجھ ہی سے غلطی ہوئی۔ مراد یہ تھی کہ مہدی علیہ السلام کی عمران کو ملے گی، روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس سال کی عمر میں حضرت امام مہدی کا ظہور ہوگا اور (۹) سال قیام فرماکر وفات پائیں گے۔ کہنا یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو یہ فرمارہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات نہیں ہوئی ہے تو اس میں بھی ابن اسحاق کی روایت کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی کچھ اجتہادی نتیجے ہی کی نیرنگی تھی، سیرت ابن اسحٰق کے حوالہ سے زرقانی نے شرح مواہب میں نقل کیا ہے کہ قرآنی آیۃ یکون الرسول علیکم شہیدا سے اپنے نزدیک وہ یہی سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اس وقت تک نہیں ہوسکتی، جب تک مؤمن کو منافق سے شہادت دیکر آپ جدا نہ کرلینگے۔ ص۲۷۸ زرقانی ج ۸

حقیقت تو یہ ہے کہ دیکھنے والوں کو جو کچھ دکھایا گیا تھا، حالانکہ بعض وجوہ سے سب کا ذکر مناسب نظر نہ آیا[1]، لیکن ناقابل تردید وثائق کی روشنی میں جو کچھ بھی پیش کر دیا گیا ہے، میرے نزدیک تو ایک طرف نہ ماننے والوں کے سامنے سوء اتفاق و بخت کی توجیہ کی بیڑیاں ٹوٹنے کے لئے اگر وہ کافی ہے تو دوسری طرف ماننے والوں پر خوش عقیدگی کی تہمت کی گنجائش بھی اپنا خیال تو یہی ہے، کہ ان شہادتوں نے باقی نہیں رکھی ہے

صدق وصفا، اخلاص و وفا کے ساتھ کوئی آگے بڑھنے کی ہمت تو کرے، خواجہ کی روش[2] بندہ پروری ان ہی شکلوں میں اس کے سامنے آئے گی، پہلے بھی اسی کا تجربہ کیا گیا ہے، اور اب بھی جس کا جی چاہے تجربہ کر کے دیکھ سکتا ہے۔

---

[1] مثلاً یہی بات کہ علالت کے آخری دنوں میں "ذات الجنب" کے عارضہ میں بھی سیدنا الامام الکبیر مبتلا ہو گئے تھے، اس میں شک نہیں کہ روایتوں ہی میں یہ بھی آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات جس بیماری میں ہوئی وہ ذات الجنب کی بیماری نہ تھی، لیکن ان ہی روایتوں میں یہ بھی ہے کہ آپ کی وفات ذات الجنب ہی کی بیماری میں ہوئی، حافظ ابن حجر نے دونوں روایتوں میں تطبیق دیتے ہوئے لکھا ہے، کہ ذات الجنب کی ایک قسم تو ایسی ہے جس کے متعلق حدیثوں میں آیا ہے کہ شیطان کو اس میں دخل ہوتا ہے، لیکن ذات الجنب ہی کی ایک قسم اور ہے جس میں پسلی کی ہڈیوں کے اندر ریاح اٹک جاتی ہے۔ لکھا ہے کہ یہ عام عارضہ ہے پس حضرت عائشہؓ کا یہ فرمانا کہ ذات الجنب کی بیماری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، ہم اس حدیث کو دوسری قسم پر محمول کریں گے (دیکھو فتح الباری ص۱۲۱ ج ۸)

طرفہ ماجرا یہ ہے کہ مصنف امام کے بیان سے جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی وفات ذات الجنب کے اس عارضہ کے بعد ہوئی، لیکن ۱۲۹۷ھ کی روداد میں مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ نے لکھا ہے کہ بمرض ضیق النفس ۴۹ سال کی عمر میں بمقام دیوبند اس عالم ربانی کا اس عالم فانی سے انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ص۲ گویا یہاں بھی اس مسئلہ میں کچھ اختلاف کا رنگ باقی ہی رہا ۱۲

[2] اس شعر کی طرف تلمیح ہے ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن

کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند (حافظ)

محمد طیب غفرلہٗ

صدق من قال

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد

اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

قصہ اب ختم ہی ہو رہا ہے، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے سیدنا الامام الکبیر کے ایک معاصر بزرگ جو دیوبندی علقہ کے اکابر میں تو شمار نہیں ہوتے، لیکن اس کتاب میں لکھا ہے کہ

"صاحب مکاشفہ و مراقبہ ہیں، اور عمدہ لوگوں میں ہیں"

یہ انبالہ کے مشہور، بیدار دل صوفی، سائیں توکّل شاہ نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کی وفات پر زیادہ زمانہ نہیں گذرا ہے۔ اپنے وقت میں ان کی ذات بھی مرجع انام تھی، سیدنا الامام الکبیر کو سائیں جی نے اس وقت تک دیکھا بھی نہ تھا صرف نام سنا تھا، اسی زمانہ میں ان کو ایک رؤیا، ہوئی، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے ان کے اسی خواب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"ایک وسیع شاہراہ ہے، اس میں بہت سے نقش قدم معلوم ہوتے ہیں، اور چلنے والا کوئی نظر نہیں آتا، (شاہ صاحب نے) پوچھا کہ یہ نشان کس کے قدم کے ہیں، (جواب میں) آواز آئی کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری اسی راہ سے گئی ہے، اور جملہ صحابہ و تابعین و تبع تابعین بھی اسی راہ سے گئے ہیں"

لکھا ہے کہ اس غیبی آواز کو سن کر

"شاہ جی کو شوق زیارت حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا از حد ہوا، اور کمال شوق میں بے تحاشا دوڑے کہ جلد تر زیارت سے

مشرف ہوں، اسی دوا دوش میں کبھی شاہ جی کا قدم نشان قدم
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑتا، اور کبھی صحابہ کرام، اور کبھی
تابعین، کبھی تبع تابعین پر، اسی حالت میں جو یکایک پیچھے
نظر (شاہ جی صاحب) کی پھری، تو دیکھا کہ ایک اور شخص بھی
اسی راستہ کو آتا ہے، مگر آہستہ آہستہ اور کچھ دیکھتا ہوا"۔
اس آنے والے شخص کو اس طریقہ سے چلتے ہوئے دیکھ کر بیان کیا ہے کہ
"شاہ جی کو حیرت ہوئی کہ یہ کیسا کاہل شخص ہے، کہ ایسا
آہستہ آہستہ سے چلتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس کو شوق
کم ہے"۔
دل میں سائیں توکل شاہ صاحب فرماتے تھے کہ میں یہی باتیں کر رہا تھا، آخر بے
اختیار ہو کر مجھ سے
"نہ رہا گیا، اور اس شخص کے پاس آکر پوچھا، کہ تم کون ہو؟"
جواب میں سائیں توکل شاہ صاحب سن رہے تھے کہ کہنے والا ان سے کہہ رہا
ہے، کہ میں
"محمد قاسم"
ہوں، لکھا ہے، کہ یہ سن کر اپنی پنجابی زبان میں سائیں جی فرمانے لگے کہ
"بابا شوق نال بھجیا"
جس کے معنی ہیں، کہ "بابا شوق کے ساتھ دوڑ" سائیں جی نے سنا کہ اس کے
جواب میں ان سے کہا جا رہا ہے
"میں تو نشان قدم رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر قدم رکھ
رکھ کر چلتا ہوں، اور جس جگہ قدم خوب محسوس نہیں ہوتا، وہاں

تامل کرتا ہوں، جب تک خوب یقین نہیں ہو جاتا کہ یہی نشانِ قدم ہے، اس وقت تک دوسرا قدم نہیں اٹھاتا۔"

آخر میں یہ بھی فرمایا گیا، کہ

"گو دیر میں پہنچوں، مگر قدم بقدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے چلوں گا۔"[۵۵] ص۵۶ سوانح مخطوطہ

سوانح نگار نے سائیں جی رحمۃ اللہ علیہ کی اس رویا کے ساتھ یہ خبر بھی دی ہے کہ بیدار ہونے کے بعد سائیں جی کے قلب مبارک میں سیدنا الامام الکبیر کی ملاقات کا شدید اشتیاق پیدا ہوا،

آخر کسی نہ کسی طرح اپنی اس آرزو کے پوری کرنے میں کامیاب ہوئے، سیدنا الامام الکبیر پر جوں ہی سائیں جی توکل شاہ کی نظر پڑی لکھا ہے کہ

"دیکھتے ہی بلا استفسار پہچان لیا، اور معتقدانہ ملے۔" ص۵۶ "

اور کیسے نہ پہچانتے ع

رقم مہر تو بر چہرۂ من پیدا بود

اللہ اللہ جس کا قال ہی نہیں بلکہ حال، واقعی حال

اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری

بن چکا ہو، گلاب کے پھول کو دیکھ کر اس لئے تڑپ اٹھتا ہو، کہ منسوب کرنے والوں نے کسی کی طرف اس پھول کو منسوب کیا ہے۔[۵۶] جس کی فنائیت اس درجہ تک پہنچی

---

[۵۵] میں نے اپنے بزرگوں سے اس رؤیا کا ایک جزو اور سنا ہے اور وہ یہ کہ سائیں صاحب اسی دوڑ دھوپ کے ساتھ بالآخر جب مجمع کو چیرتے پھاڑتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گئے تو دیکھا کہ حضرت نانوتویؒ وہاں حضور کے پاس پہلے سے موجود ہیں ۱۲ محمد طیب غفرلہٗ

[۵۶] تذکرۃ الرشید ارواح طیبہ وغیرہ میں ہے کہ حضرت گنگوہی نے ایک دفعہ لوگوں سے پوچھا کہ گلاب کے پھول سے مولانا محمد قاسم کو کیوں زیادہ محبت تھی پھر خود ہی اس راز کو فاش فرمایا کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ دی ہو، یاد ہوگا' سوانح مخطوطہ ہی کے حوالہ سے کسی دوسرے صاحب دل کا روحانی مکاشفہ نقل کرچکا ہوں، یعنی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں ان صاحب نے دیکھا کہ معانقہ کا شرف سیدنا الامام الکبیر کو بخشا گیا ہے۔ معانقہ کے اسی حال میں ان کو محسوس ہوا کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک مولٰنا کے جسم مبارک میں سمانا شروع ہوا، یہاں تک کہ ہر عضو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر عضو مولٰنا میں سما گیا الا سر مبارک" ص۱۵

اور یہ سارے تماشے جو آپ کے سامنے پیش ہو رہے ہیں، اسی مٹ جانے ہی کے تو تماشے ہیں، بات بہت پھیل جائے گی' آئیے' اور آخری نظارے کو بھی دیکھ لیجئے۔

مصنف امام کے حوالہ سے سنا چکا ہوں کہ تقریباً شب چہارشنبہ سے پنجشنبہ کی دوپہر تک وہی تشنج وہی غشی کی حالت طاری رہی، اسی سلسلہ میں مولٰنا حکیم منصور علیخاں صاحب حیدرآبادی نے اپنی کتاب میں یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ سیدنا الامام الکبیر کی نزاکت حال کو دیکھ کر

"مولوی رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ (دیوبند) کے خطوط جا بجا پہنچے کہ اب حالت مرض ترقی پر ہے "جلد چلے آؤ"

(بسلسلہ صفحۂ گزشتہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینے سے گلاب کی خوشبو آتی تھی، یہ تو یہ حدیث ضعیف، لیکن پھر بھی حدیث ہی ہے، اشارہ آپ کا اس حدیث کی طرف تھا۔ جس میں آیا ہے کہ من اراد ان یشم رائحتی فلیشم رائحۃ الورد (یعنی میری خوشبو جو سونگھنا چاہتا ہے چاہئے کہ وہ گلاب کے پھول کو سونگھے)، ہاشم بن عروہ کی سند سے سیوطی نے لآلی مصنوعہ میں اس کا ذکر کیا ہے لیکن عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ گلاب کا پھول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینہ سے پیدا ہوا، محدثین نے اس روایت کو موضوع اور جعلی قرار دیا ہے۔ (دیکھو لآلی مصنوعہ ص۱۴۶/۲ مطبوعہ مصر)

اس گشتی چٹھی کا پہنچنا تھا کہ دیوانہ وار جو جہاں تھا، وہیں سے دوڑ پڑا، حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ

"سب احباب امروہہ، مرادآباد، میرٹھ، سہارنپور، گنگوہ، نانوتہ وغیرہ سے جمع ہو گئے تھے" ص ۱۲۸

مرادآباد کے قافلہ کے ساتھ حکیم صاحب بھی افتاں خیزاں پہنچے، لکھا ہے کہ

"بندہ بھی خدا دیکھتے ہی دیوبند پہنچا"

جس وقت وہ دیوبند پہنچے ہیں، ان کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا

"مولوی ذوالفقار علی صاحب کے مکان پر بڑا مجمع تھا"

یہ مولوی ذوالفقار علی صاحب سیدنا الاستاذ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد ہیں۔ ذکر کر چکا ہوں کہ علالت کے آخری دنوں میں سیدنا الامام الکبیر کو لوگ اسی مکان میں لے آئے تھے، علاج و معالجہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا، اسی مکان میں ہو رہا تھا حکیم صاحب نے بھی لکھا ہے کہ

"طرح طرح سے علاج کیا گیا، کارگر نہ ہوا"

اسی کے بعد وہی خبر دیتے ہیں کہ

"جمعرات کے دن قریب دوپہر کے سب کا مشورہ ہوا کہ مولانا صاحب کو مکان پر لے جانا مناسب ہے"

اور یوں حضرت شیخ الہند کے مکان سے سیدنا الامام الکبیر کے ذاتی مکان جہاں آپ کے اہل و عیال تھے، لوگ آپ کو لے چلے، کس طرح لے چلے، حکیم صاحب لکھتے ہیں کہ

"چارپائی کو تمام خدام آہستہ آہستہ اٹھائے ہوئے مکان پر لے گئے"

دن کے آٹھ پہروں میں سے جمعرات کے دن کے دو پہر تو گذر ہی چکے تھے گھڑی کے حساب سے دو بجے کا وقت ہوگا، کہ وہی جس پر غشی طاری تھی، چارپائی پہ آہستہ آہستہ لانے والے سمجھے ہوئے تھے کہ اب کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ نہ حواس ہی باقی رہے ہیں، نہ ہوش ہی باقی رہا ہے، اور نماز کی طرف توجہ دلانے کے بعد جب "اچھا" کے سوا منگل کے دن ظہر کے وقت سے سننے والوں نے کچھ نہیں سنا تھا، تو سمجھنے والے ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کیا سمجھ سکتے تھے۔

گویا آخری لفظ اس وقت تک خیال یہی تھا، کہ زبان مبارک سے جو نکلا ہے، وہ یہی "اچھا" کا لفظ ہے، لیکن حکیم صاحب راوی ہیں کہ حضرت والا کو پہنچانے والوں نے اپنے ذاتی مکان میں جب پہنچا دیا، تو

"دو بجے کے بعد پاس انفاس کی آواز اس زور سے آنے لگی کہ باہر دروازے کے بھی میں نے سنی۔" ص۱۹۰

کون بتائے کہ اتنی طویل غفلت وخاموشی کے بعد یہ "پاس انفاس" کی آواز اور وہ بھی اتنی بلند اور جہری کہ گھر کے اندر پاس والے ہی نہیں، بلکہ باہر والے بھی اسے سن رہے تھے[1]۔ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ؎

مارا وداع کرد دل وعقل ہر چہ بود
الا سر نیاز بر آں آستاں کہ بود

---

[1] شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد ماجد شیخ سیف الدین کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے اخبار الاخیار کے خاتمہ میں لکھا ہے کہ "چشم کشادند وآہستہ گفتند۔ پاس انفاس از برائے امروز کاری آمد کہ اعضا ہمہ از کار رفتہ است وقوت دم زدن نماندہ است" اس ارشاد کے بعد لکھا ہے کہ ان کے والد نے

"چند بار زور نمودند وبلند تر ذکر لا الہ الا اللہ فرمودند وساکن شدند وبپاس انفاس مشغول شدند" اسی کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ اخبار ص۳۱۱

گویا یہ زندہ شہادت تھی اس بات کی، کہ ؎

بخدا کہ سینہ ام را بشگاف و جاں بروں کن

کہ درونِ خانۂ تو دگرے چہ کار دارد (خسرو رح)

عارف رومی والی نماز ع

عاشقان ھم فی صلاۃ دائمون

کا یہ ناقابلِ انکار ثبوت تھا، یا سمجھئے کہ اسی دوامی نماز کی یہ عملی شکل تھی۔ اللہ اللہ جو ہمہ تن وہمہ جان کے ساتھ نماز ہی میں مستغرق و مستہلک تھا، اسی کو عقل و ہوش والی نماز کا مکلف بنا کر توجہ دلانے والے جو توجہ دلا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ "اچھا" کے سوا ان کو اور جواب ہی کیا دیا جا سکتا تھا۔

کچھ بھی ہو، سچی بات تو یہی ہے کہ آج کوچہ چیلان (دلی) کے "ہو" والے مکان کی محنت کام آ رہی تھی، رحم اللہ قائلہ

خسرو زغمت عناں نہ تابد

تا مرکب عمر سر نیابد

مرکب عمر کا سوار اپنی آخری منزل پر ہے، زندگی کے سارے دن، صرف اسی ایک دن کی فکر میں جس کے بسر ہوئے تھے، آج اپنی محنت کا ثمرہ اس کے سامنے نہ آتا تو کب آتا، تمنا کرنے والے نے تمنا کی تھی کہ

زندگی مرنے کے کام آئے تو خوب

آج زندگی اور زندگی کی ساری جد و جہد کا حاصل کام آ رہا ہے، اور کس طریقہ سے کام آ رہا ہے، سننے والے تو "پاس انفاس" کی آواز سن رہے تھے، اور دیکھنے والے دیکھ رہے تھے، حکیم صاحب بھی سننے والوں کے ساتھ اس واقعہ کے دیکھنے والوں میں تھے، خود ہی لکھتے ہیں کہ

"مولانا رشید احمد صاحب قریب چارپائی کے تشریف رکھتے تھے"

مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"بدھ کے روز دوپہر سے پہلے مولوی صاحب (یعنی مولانا گنگوہیؒ) تشریف لائے"

تقریباً ۲۴ گھنٹے پہلے گویا تشریف لا چکے تھے، اور اس وقت وہی چارپائی کے پاس آکر بیٹھ گئے تھے۔

آپ نے سمجھا؟ دم واپسیں کی اس نازک کڑی گھڑی میں بالین مبارک پر کسے لاکر بٹھایا گیا ہے؟ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک رشتہ تو رفاقت و محبت کا تھا، طالب العلمی کے دنوں سے جس رشتہ کی ابتدا ہوئی تھی، دونوں اس کے بعد رزم کے میدانوں میں بھی، اور بزم کی مجلسوں میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ رہے، ہم استاد وہم شیخ تھے، تقریباً چالیس سال تک ناسوتی عالم میں یہ رشتہ بغیر کسی انقطاع کے یوں ہی مسلسل قائم رہا

کوئی شبہ نہیں کہ اس تعلق کو پیش نظر رکھتے ہوئے نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت گنگوہی پر کیا گذر رہی ہوگی۔ مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چوبیس گھنٹوں میں،

"سکوت اور نماز میں اکثر گذرتی تھی"

وہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ مولوی صاحب (مولانا گنگوہی) کو ایسا صدمہ ہوا ہے کہ

"اس سے زیادہ کیا متصور ہو" اُف

اندیشہ بھی جس حال کا اندیشۂ جاں تھا
آنکھوں سے اسی حال کو میں دیکھ رہا ہوں

جو اس حال میں مبتلا کیا گیا ہو، کیا پوچھتے ہیں، کہ کیسی بجلیاں اس کے اندر کوند رہی ہونگی تاہم اسی کے ساتھ یہ بھولنا نہ چاہیئے کہ وقت کے محدث و فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ

جو نہیں جانتے ان کو کیسے بتایا جائے کہ "قطب عالم" کا لفظ خلق کی زبان پر ان کے متعلق کس نے جاری کرا دیا تھا، اور کیوں جاری کرا دیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ باہر سے دیکھنے والے تو صرف یہی دیکھ رہے تھے کہ وہ "چار پائی" کے قریب بیٹھے ہیں" مگر ان کے اندر جو تلاطم برپا تھا، جو آگ لگی ہوئی تھی، ستر و اخفاء کی انتہائی کوششوں کے باوجود بے اختیار ہو کر خود ہی خدام خاص کی ایک مجلس میں جیسا کہ ارواح طیبہ میں ہے ایک دفعہ کھل پڑے، فرمانے لگے کہ

"اگر وہ بات نہ ہوتی تو میں مولنا کے صدمہ کا تحمل نہیں کر سکتا تھا"

"تحمل نہیں کر سکتا تھا" جانتے ہیں کہ اس کا مطلب کیا تھا، خود ہی اس کا یہ جواب حضرت والا نے دیا کہ

"مرجاتا"

گو، آج بجائے ایک جنازے کے اسی گھر سے دو جنازے[1] نکلتے۔ یہ بیان وقت کے حجت اور حدیث کے شیخ کا ہے، مگر ایک "بات" تھی جس کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا، پوچھنے والوں نے پوچھا بھی کہ "حضرت وہ بات کیا؟" بھلا اس کا جواب وہ خود کیا دے سکتے تھے، تاہم اتنا اشارہ کر دیا گیا کہ

"میاں وہی چیز جس کی وجہ سے تم میرے پاس آتے ہو[2]"

---

[1] میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت گنگوہی رح اس صدمۂ جانکاہ کے بعد عمر بھر کھل کھلا کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھے گئے۔ محمد طیب غفرلہٗ

[2] حکیم الامت تھانوی رح نے اپنی اسی روایت کے ذیل میں ارقام فرمایا ہے کہ کسی راوی سے یہ الفاظ سنے ہیں کہ "وہی چیز جس کی وجہ سے تم مجھے بڑا سمجھتے ہو" پھر خود اس کی شرح یہ فرمائی گئی ہے کہ "مراد نسبت باطنیہ سے ہے کہ اسی سے ایسی مقاومت کی قوت ہوتی ہے۔" آگے یہ بھی اضافہ کیا گیا ہے کہ "اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ حزن طبعی، منافی کمال باطنی کے نہیں۔ مگر ناقص کی طبیعت غالب ہو جاتی ہے اور کامل کی عقل۔" صفحہ ۲۱ ارواح ثلاثہ

اسی کے ساتھ شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت کا (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

میں کیا کروں۔ ارواح طیبہ کی اس روایت کو نقل کر رہا ہوں، اور معرفۃ الصحابہ کی کتابوں کا یہ فقرہ دماغ میں گھوم رہا ہے

کان سبب موتہ کمدا لحقہ علی وفاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مازال یذیبہ	حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کی وجہ ان کا وہ کمد تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی وجہ سے ان کے دل میں جاگزیں تھا، یہی کمد آپ کو گھلاتا چلا جا رہا تھا۔

علامہ الدمیری نے اسی فقرے کو نقل کر کے "کمد" کا مطلب یہ بیان کیا ہے

الکمد الحزن المکتوم (حیات الحیوان الکبریٰ صفحہ ۴۴ ج ۱)	کمد سوز درونی اور غم پنہانی کو کہتے ہیں۔

ایک طرف ہمارے مصنف امام تھے جو کہتے پھرتے تھے کہ

"گھبراؤ مت! ابھی دس برس مولانا اور زندہ رہیں گے"

اب دوسری طرف حضرت گنگوہی کے اس کمد یا سوز درونی کو دیکھئے، لیکن باوجود اس کمدیت اور سوزش نہانی کے، جاننے والے بھی جانتے ہیں، کتابوں میں بھی لکھا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کے صدمہ اور قائم مقامی کا سارا بار اسی حال میں اپنے سر پر اٹھائے ہوئے، جیتے رہے، جب تک زندہ رہنا ان کے لئے مقدر

(گذشتہ صفحہ سے) جب خیال آتا ہے جس کا ذکر بھی اسی کتاب ارواح ثلاثہ میں کیا گیا ہے یعنی سیدنا الامام الکبیر کی وفات کے بعد مولانا گنگوہی نے حضرت شیخ الہند رح سے فرمایا کہ تیس برس کی محنت سے جو بات قائم ہوئی تھی وہ آج نہیں ہے" صفحہ ۲۸۳ ارواح ثلاثہ۔ واللہ اعلم اس کا کیا مطلب ہے۔ لیکن اگر باطنی نسبت ہی کی طرف اشارہ ہے تو حضرت گنگوہی کو اس صدمہ کے تحمل میں جو کچھ برداشت کرنا پڑا ہوگا، اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، تحمل کی بنیاد اسی باطنی نسبت پر قائم تھی، اسی میں اضمحلال کی کیفیت آپ کو محسوس ہوئی، تو باوجود اس کے بھی مصیبت کے اس پہاڑ کو سر پر اٹھالینا ان ہی کا کلیجہ اور جگر تھا ۱۲

تھا۔ نیز دار العلوم دیوبند کی جو روداد سیدنا الامام الکبیر کی وفات کے سال یعنی ۱۲۹۷ھ میں شائع ہوئی تھی، اس میں بھی اس حادثہ جاں گداز، روح گسل کی خبر دیتے ہوئے، مولانا رفیع الدین نے یہ ارقام فرمانے کے بعد کہ

"یہ واقعۂ جانکاہ ایسا نہیں ہے کہ یکایک زمانہ اور اہل زمانہ بھول جائیں"

پھر مختصر لفظوں میں سیدنا الامام الکبیر کی جلیلہ خدمات کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہوئے کہ

"مدت العمر اسلام، اور اہل اسلام کی خیر خواہی میں رہے اور تمام عمرِ عزیز کو اعلاءِ کلمۃ اللہ میں صرف فرمایا، واقعی ایسے عالی قدر اولوالعزم صاحب کمال خیر خواہ کافہ اہل اسلام کا انتقال فرمانا عموماً گروہ پاک اسلام پر ایک سخت حادثہ ہے، خصوصاً اس مدرسہ کو کیونکہ اس چشمۂ فیض کا منبع، اور اس آبِ حیات کا مصدر اور اس آفتاب عالمتاب کے مظہر آپ ہی تھے"

آخر میں مولانا رفیع الدین صاحب نے ارقام فرمایا ہے کہ

"مگر اللہ تعالیٰ جل و علا نے ان (مسلمانان ہند اور اہل مدرسہ) پر رحم فرما کر نعم البدل عطا فرمایا، اور ان کی مصیبت کو نسیاً منسیا کر دیا۔ یعنی جناب مولانا مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی سلمہ اللہ تعالیٰ نے جو مثل مولانا مرحوم کے ہیں۔ اور شہرہ آفاق، سرپرستی مدرسہ و اہل مدرسہ کی قبول فرمائی اور اپنا دست شفقت ان کے سر پر رکھا اور جیسے مولانا رحمۃ اللہ علیہ ظاہری و باطنی امداد اس مدرسہ کی فرماتے تھے، ایسے ہی مولانا موصوف فرماتے ہیں" (روداد ۱۲۹۷ھ صـ ۲)

میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے مصنف امام کے طرزِ عمل اور اعلان میں جیسے فاروقی رنگ جھلک رہا تھا، ٹھیک اسی کے مقابلہ میں رسالت کبریٰ کے صدیق اکبر کی تجلی نگاہوں کے سامنے حضرت گنگوہی کو چارپائی کے پاس دیکھ کر اگر کوندگئی ہو، تو آپ ہی بتائیے کہ یہ کوئی اچنبھے کی بات ہو سکتی ہے؟ آخر اس زمانہ میں دیکھنے والے جو یہ چلا اٹھے تھے، کہ

"وفات سرورِ عالم کا یہ نمونہ ہے"[1]

تو آخر وہ کچھ دیکھ ہی تو رہے تھے، تاریخ کے بیسیوں مادوں میں سے سب سے بہتر اسی مادۂ تاریخ کو وقت کے صالحین و قانتین نے جو قرار دیا تھا۔

اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو کچھ وہ دیکھ رہے تھے، ان کو جو کچھ دکھایا جا رہا تھا، اسی کی تصویر تاریخ کے اس مصرعہ میں اتر آئی تھی۔

بہرحال چارپائی کے پاس تو یہی قطب عالم، محدث وقت، حضرت گنگوہی تشریف فرما تھے، اور جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے۔

"سب احباب امروہہ، مرادآباد، میرٹھ۔ سہارنپور، نانوتہ وغیرہ کے جمع ہو گئے تھے"

اندر سے پاس انفاس کی آواز کانوں میں آرہی تھی، کہ جمعرات کے دن بقول مصنف امام

---

[1] سیدنا الامام الکبیر کی وفات کی تاریخیں بہت سی لکھی گئی تھیں، لیکن بالاتفاق پسند کرنے والوں نے سب سے بہتر مادہ تاریخ اسی مصرع کو قرار دیا تھا، یہ مولانا شبیر احمد صاحب کے والد ماجد مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرحوم کا نکالا ہوا مادۂ تاریخ تھا۔ چند دوسرے اشعار کے ساتھ مادہ تاریخ کے اس مصرعہ کو انہوں نے یوں موزوں فرما دیا تھا۔

وہ غم ہے قاسمِ بزمِ ہدیٰ کی رحلت کا	کہ جرعہ نوشِ الم جس سے ہر دردنہ ہے
یہ ایسا غم ہے کہ جس غم سے بزمِ عرفاں کا	مثالِ خُمِ فلک جام واژگونہ ہے
کچھ اک زمیں ہی نہیں زرد رنگ اس غم سے	لباس چرخ بھی ماتم میں نیلگونہ ہے
سن وفات لکھی فضل نے زروئے الم	وفاتِ سرورِ عالم کا یہ نمونہ ہے
	۱۲۹۷ھ

"بعد نماز ظہر اچانک دم آخر ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون"

اگرچہ ۱۲۹۷ھ کی مذکورہ بالا روداد میں مولٰنا رفیع الدین صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے، کہ

"صفحۂ جہاں پر، اس قسم کے وقائع اکثر درج ہیں"

اور حیات جاودانی کے سب سے بڑے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی جب

انک میت وانھم میتون۔ (الزمر)	تم بھی مرنے والے ہو، اور وے بھی مرنے والے ہیں۔

کے قانون کے نیچے داخل کرتے ہوئے، مسلمانوں کو آگاہ کر دیا گیا تھا،

وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افأن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیہ فلن یضر اللہ شیئًا (آل عمران)	نہیں ہیں محمد مگر ایک رسول، گذر چکے ان سے پہلے بہت سے رسول کیا وہ (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اگر مر جائیں، یا قتل ہو جائیں تو تم پلٹ پڑو گے اپنی ایڑیوں پر، اور جو پلٹ پڑے گا اپنی ایڑیوں پر، وہ اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچائے گا۔

قرآن کی اسی بخشی ہوئی آگاہی سے تاریخ اسلام کے سب سے بڑے وقت میں بیہوشوں کو ہوش میں لایا گیا تھا، لیکن بااین ہمہ اسلامی ہند کی امت اسلامیہ جن تیرہ و تار خونیں دنوں سے گذرتے ہوئے اس وقت تک پہنچی تھی، اس حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے بے ساختہ خسرو رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر یاد ہی آجاتا ہے کہ

پیوستہ روز غمزدگان تیرہ بود تنگ
از روزگارِ تیرۂ من تیرہ تر نہ بود

کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانان ہند کی تاریخ کے تاریک دنوں میں اپنی وقتی نزاکتوں کے

لحاظ سے آج کا یہ دن شاید سب سے زیادہ بھیانک سب سے زیادہ سیاہ تھا۔ بہرحال جوں ہی کہ یہ خبر قصبہ اور قصبہ کے اطراف و نواح میں پہنچی، حکیم منصور علی خاں صاحب کا بیان ہے،

"ہزار ہا آدمی اطراف و جوانب سے اس وقت چلے آئے۔" صد ۱۹۱

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاروں طرف سے خلق اللہ ٹوٹی پڑتی تھی، جو جہاں تھا، وہیں سے گویا یہی کہتے ہوئے چل پڑا کہ ؎

اے دل ز چشم زخم زمانہ فگار شو

اے چشم از تراوش دل اشکبار شو

گریہ و بکا کا ہنگامہ برپا تھا، بقول مصنف امام

"ایک قیامت برپا ہو گئی"

یہ الفاظ بھی ان ہی کے ہیں، کہ

"مولوی صاحب کے انتقال کا سا غم و الم کبھی نہ دیکھا تھا، ایک ماتم عام تھا، ہرچند شور و غوغا اور سر پیٹنا اور کپڑے پھاڑنا، نہ تھا۔ کیونکہ بہ برکت صحبت مولٰنا جتنے لوگ تھے، حدود شرعی سے باہر نہ ہوتے تھے، مگر ایسا غم عام ہم نے دیکھا نہ سنا۔"

اپنے اوپر قربان ہو جانے والے عاشق جاں باز کی آخری دید کی تمنا میں جو بھی تھا، قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش میں تھا۔ لیکن اس چھوٹے سے مکان میں انسانوں کے امنڈے ہوئے اس سیلاب کی بھلا کیا گنجائش نکل سکتی تھی، مصنف امام نے لکھا ہے،

"گھر میں وسعت نہ تھی، مدرسہ میں لاکر جنازے کو رکھا۔"

لیکن جنازہ ابھی تیار نہیں ہوا تھا، حکیم منصور علی خاں حیدرآبادی کی روایت ہے،

"مدرسہ میں غسل دیا گیا تھا۔"

باوجودیکہ ظہر کی نماز کے بعد جیسا کہ بیان کر چکا ہوں، یہ حادثۂ فاجعہ پیش آیا تھا، لوگوں کے ہجوم اور اژدہام کو بھی آپ دیکھ رہے ہیں، لیکن حیرت ہوتی ہے، حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ

"جنازے کو عصر کی نماز کے بعد اٹھایا گیا۔"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ عصر کی نماز تک جنازہ تیار ہو گیا، اور نماز پڑھ کر لوگ لے چلے، اس لئے لے چلے کہ نماز کے لئے مدرسہ میں بھی دیکھا گیا کہ گنجائش نہ نکل سکے گی۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ

"باہر شہر کے میدان میں نماز ہوئی۔"

افسوس کہ اس میدان کی صحیح نشاندہی نہیں کر سکتا[1]۔ میرے پاس جو وثائق ہیں، ان میں اس کی اطلاع نہیں دی گئی ہے[2]۔ بہرحال نماز مدرسہ میں نہیں، بلکہ شہر کے باہر کسی میدان میں ہوئی، لوگ جنازے کو کندھوں پر اٹھائے لئے جا رہے تھے، حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ

"سینکڑوں آدمی جنازہ کو اٹھانا چاہتے تھے۔"

---

[1] کسی صاحب کو معلوم ہو، تو اس تاریخی میدان کی تعیین فرما دیں۔ بظاہر قیاس یہی چاہتا ہے کہ مدرسہ کے شمال کی طرف قبرستان کے ارد گرد آبادی کے باہر جو زمین ہے اسی کے کسی حصہ میں نماز جنازہ ادا ہوئی ۱۲

[2] احقر نے اپنے اکابر سے سنا ہے کہ جس مقام پر حضرت والا کی قبر ہے، یہ پہلے وسیع میدان تھا، اور بہت کافی وسیع تھا، اسی سے ملحق ایک بہت بڑا باغ تھا، اسی میں نماز جنازہ پڑھی گئی تھی ۔ مذکورہ میدان اسی دن قبرستان کے لئے وقف کیا گیا، حضرت والا کی وصیت تھی کہ مجھے گورغریباں میں دفن کیا جائے اسی وصیت کے مطابق حضرت کے فدائی مرید حکیم مشتاق احمد صاحب نے یہ پورا میدان وقف کر کے قبرستان کیلئے دیدیا، سب سے پہلی قبر اس میں حضرت والا کی ہوئی، اور آج یہ ہزارہا علماء و صلحاء کا مدفن ہے۔ یہ زمین دارالعلوم کے جانب شمال واقع ہے، اب اس میں قبرستان کے ارد گرد زراعت بھی ہونے لگی ہے اور قبرستان کے نگران فقیروں کے کوٹھے اور رہائشی کچے مکان بھی بن گئے ہیں جس سے میدانی صورت باقی نہیں رہی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس کش مکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ

"چار پائی چڑ چڑ کرنے لگی "

یہ بھی ان ہی کی روایت ہے، کہ اس حال کو دیکھ کر

"حاجی محمد عابد صاحب نے غل مچایا کہ اس قدر ہجوم جنازہ اٹھانے کو سب
مت کرو، چارپائی ٹوٹ جائے گی "

اس شان کے ساتھ اپنے اور مٹ جانے والے کو مسلمان اس میدان تک لائے حکیم
صاحب نے اس موقع پر اسی میدان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"قریب مغرب کے باغ میں جا کر جنازے کو رکھا "

جس وقت نماز جنازہ کی صف بندی ہونے لگی، علاوہ عام مسلمانوں کے حکیم صاحب
نے یہ بھی دیکھا تھا کہ

"بہت آدمی جنازہ میں کمبل پوش فقراء موجود تھے "

مصنف امام کا بیان ہے کہ

"مغرب سے پہلے نماز ہوئی "

عام مسلمانوں نے جن میں اہل علم وفضل، ورع وتقویٰ کے ساتھ کمل پوش فقراء کی بھی کافی
تعداد تھی، جنازے کی نماز پڑھی، اور زمین کا وہی قطعہ جس کے متعلق مولنا طیب صاحب
نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ

"بوقت وفات حضرت (سیدنا الامام الکبیر) نے وصیت فرمائی کہ
مجھے گورِ غریباں میں دفن کیا جائے "

جس کا مطلب یہی ہوا کہ دیوبند کے شیوخ اور سر برآوردہ حضرات کے مقبروں کی جگہ
عام اور غریب مسلمان جہاں دفن ہوتے ہیں، وصیت فرمائی گئی تھی کہ ان ہی غریبوں کے

(گذشتہ صفحہ سے) آگے متن میں مصنف نے اسے تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ محمد طیب غفرلہ

پاس انہیں سلادیا جائے، ہندوستان کے آخری اسلامی حکمراں نے بھی یہی آرزو کی تھی کہ ؎

شاہوں کے مقبروں سے الگ مجھ کو گاڑیو

ہم بےکسوں کو گورِ غریباں پسند ہے

اسی شاہانہ آرزو کا اعادہ ہندوستان کے ایک فقیر کی طرف سے بھی کیا گیا تھا، اسی آخری وصیت کی تکمیل، بقول مولٰنا طیب صاحب سیدنا الامام الکبیر کے فدائی حکیم مشتاق احمد دیوبندی نے یوں کی، کہ

"وفات ہی کے دن اپنی ایک ذاتی زمین وقف کر کے اسے گورِ غریباں بنادیا"

مصنف امام کے اس قول سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ

"باہر شہر ایک قطعہ زمین کا حکیم مشتاق احمد صاحب نے خاص قبرستاں کے لئے اسی وقت وقف کردیا"

بہر حال مغرب سے پہلے اسی باغ والے میدان میں جو شہر سے باہر تھا، جنازے کی نماز ادا ہوئی، اور بقول حکیم منصور علی خاں حیدرآبادی رحمۃ اللہ علیہ

"بعد نماز مغرب کے، جب شب جمعہ شروع ہوئی دفن کیا گیا"

حیرت اسی پر ہوتی ہے کہ ظہر کی نماز کے بعد عصر سے پہلے وفات ہوئی، اور نماز مغرب کے بعد تجہیز و تکفین کے سارے کاروبار سے فراغت ہوگئی۔ عام حالات میں ایسا بہت کم ہوتا ہے، مصنف امام نے بھی یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ "بعد مغرب دفن کیا" لکھا ہے کہ حکیم مشتاق احمد صاحب مرحوم کی اسی ارضِ موقوفہ میں جو گورِ غریباں کے نام سے موسوم کی گئی تھی،

"اول مولٰنا صاحب یعنی سیدنا الامام الکبیر کو دفن کیا"

اور یہی اطلاع مولانا طیب صاحب کی بھی ہے کہ اس گورِ غریباں میں

"پہلی قبر حضرت (سیدنا الامام الکبیر) ہی کی ہوئی"

دفن کے وقت تک تو انسانوں کے ہجوم کا یہ حال تھا، جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"اتنا مجمع ان بستیوں میں کبھی دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا"

ان بستیوں سے مراد آپ کی اطراف و جوانب کے وہ قصبات ہیں، جہاں شیوخ و سادات و شرفاء آباد ہیں۔ یعنی دیوبند۔ تھانہ بھون، نانوتہ وغیرہ۔ اسی کے ساتھ حکیم صاحب مرحوم کا ایک عبرت انگیز مشاہدہ یہ بھی تھا کہ کمل پوش فقراء جو اچانک خدا جانے کہاں سے سمٹ آئے تھے نماز اور دفن کے وقت تو وہ دیکھے گئے، لیکن لکھتے ہیں کہ

"بعد دفن سب غائب ہو گئے"

دفن کے بعد ہی یہ غائب ہو جانے والے رجال کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے کہاں چلے گئے؟ اس کا جواب کیا دیا جا سکتا ہے۔ رات ہو چکی تھی، ایسے وقت میں بجائے قیام کرنے کے ان کا غائب ہو جانا کچھ عجیب سی بات ہے، ورنہ ان کمل پوش فقراء کے سوا رات ہو جانے ہی کی وجہ سے اور جتنے آدمی بھی جہاں کہیں سے آئے تھے دفن کے بعد دیوبند ہی میں قیام کرنے پر مجبور ہوئے۔ حکیم صاحب نے آگے جو یہ خبر دی ہے کہ

"دوسرے دن سے مخلوق رخصت ہونے لگی" ص ۱۹۱

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، کہ عام خلقت رات گذارنے کے بعد دوسرے دن اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف واپس پلٹی۔ یہ جمعہ کا دن تھا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد لوگوں کی روانگی کا سلسلہ شروع ہوا ہوگا، اس سلسلہ میں جیسا کہ لکھا ہے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کش مکش کی ایک خاص حالت میں مبتلا ہو گئے۔ حادثہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے جو کچھ تھا، اس کا اقتضاء یہی تھا کہ اور کچھ نہیں تو پس ماندوں ہی کی تسلی کیلئے

چند دن قیام سرہانے۔ لیکن سہارنپور میں حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کا وقت بھی آخر ہو رہا تھا، سیدنا الامام الکبیر پندرہ دن، ان کی فرمائش کے مطابق قیام کر کے ذات الجنب میں مبتلا ہو کر دیوبند لائے گئے تھے۔ حضرت والا کے قیام کے زمانہ میں مولٰنا احمد علی صاحب کی طبیعت بظاہر دیکھنے والوں کے نزدیک کچھ سنبھل گئی تھی۔ لیکن درحقیقت حالت ان کی کچھ وہی تھی کہ

ان کے آنے سے جو آجاتی ہے منھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

یہی ہوا بھی کہ حضرت والا کے رخصت ہونے کے ساتھ ہی پھر نڈھال ہوئے، اور ایسے نڈھال کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی دوسرے دن اسی وجہ سے، جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے

"جمعہ کے روز سہارنپور کو تشریف لے گئے"

نماز کے بعد اگر روانگی ہوئی ہوگی، تو جمعہ کی شام کو سہارنپور پہنچے ہونگے، صرف رات ہی گذرنے پائی تھی کہ بقول مصنف امام

"شنبہ کے روز جناب مولوی احمد علی صاحب کا انتقال ہوگیا"

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے، کہ اس زمانہ میں

"مولوی صاحب (یعنی حضرت گنگوہیؒ) کی طبیعت پہلے سے ہی ناساز تھی"

اپنی ناسازی طبع کے ساتھ گنگوہ سے دیوبند، اور دیوبند سے سہارنپور کی آمد و رفت ان جاں گداز روح فرسا حوادث کے ساتھ حقیقت یہ ہے، کہ حضرت گنگوہیؒ کے لئے ابتلا کی ایسی شکل تھی کہ ان کا عام الحزن چاہیئے تو یہی کہ یہی سال ہو، ذاتی تعلقات کے سوا اللہ کے دو دو مقبول بندوں، اسلام اور مسلمانوں کے راستباز دو دو خادموں کی وفات ایک دن کے فاصلہ سے

ان کے سامنے ہوئی تھی۔ ایک کو دفن کر کے فارغ ہوئے کہ دوسرے کی تدفین میں مشغول ہونا پڑا، مصنف امام نے لکھا ہے کہ یوں

"مصیبت پر مصیبت آئی"

اعداد حروف جوڑنے سے یہی "مصیبت پر مصیبت آئی" کا فقرہ معلوم ہوا کہ دونوں بزرگوں کے سن وفات کا مادۂ تاریخ بھی ہے۔ جیسے "رضی اللہ عنہما دائما" کے فقرے میں دونوں بزرگوں کے سال وفات کا مادۂ تاریخ مولوی عبدالرحمن شاکر مالک مطبع نظامی کانپور کو ملا تھا، یہ اطلاع بھی مصنف امام ہی نے دی ہے۔

الغرض وداعی حج سے واپسی کے دو سال بعد ۱۲۹۷ھ ہجری روز پنجشنبہ دو بجے کے بعد جب نماز ظہر ہو چکی تھی، سیدنا الامام الکبیر اسلام اور مسلمانوں کی نصح و بہی خواہی میں اپنی ساری توانائیوں کو صرف فرماتے ہوئے خاکدان ارضی کی وقتی فرودگاہ یا مستقر الی حین سے "اجل مسمّی" کو پورا کر کے اپنے خالق اور مالک کے قدموں میں زبان حال ہی گویا ہم ہندی مسلمانوں کو یہ فرماتے ہوئے پہنچ گئے، کہ

مرا ہو ما نصیحت[1] بود کر دیم
حوالت با خدا کر دیم و رفتیم

گو دارالعلوم دیوبند کے قیام پر کل پندرہ سال ہی گذرے تھے، اور صحیح معنوں آپ

---

[1] سعدی کی گلستاں کے خاتمہ کا یہ مشہور شعر ہے، آج کل عموماً پند و موعظت کا مرادف قرار دے کر نصیحت کے لفظ کو اردو زبان میں لوگ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن عربی زبان میں ابتدائی مفہوم تو اس کا سینا (فارسی دوختن) کا تھا۔ بعد کو بہی خواہی، خیر اندیشی، وغیرہ ایسے کام میں جس میں دوسروں کی شکستگی کی اصلاح مقصود ہو، نصیحت کے لفظ کا اطلاق عربی زبان میں ہونے لگا۔ صحیح حدیثوں میں اسی مفہوم کے لحاظ سے فرمایا گیا ہے الدین النصیحۃ (دین صرف نصیحت یعنی بہی خواہی ہے)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کس کی بہی خواہی؟ فرمایا گیا۔ اللہ کی اللہ کے رسول کی، مسلمانوں کے ائمہ یعنی حکمرانوں کی اور خود عام مسلمانوں کی بہی خواہی بس اسی کا نام (بقیہ بر صفحہ ۱۴۶)

کی خدمات سے استفادہ کی مدت جیسا کہ عرض کرچکا ہوں، اس سے بھی کم ہے، تاہم یہ واقعہ ہے کہ ایسے محدود زمانہ میں بجائے مقامی مدرسہ کے ہمہ گیر جامعہ کے قالب میں یہ ادارہ آچکا ہے۔ واللہ اعلم میرا خیال تو یہی ہے کہ حضرت گنگوہی کو خواب میں دلہن[۱] یا عروس کی شکل میں سیدنا الامام الکبیر کی یہی خدمت غالباً پیش کی گئی تھی، کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت تک دارالعلوم دلہن بن چکا تھا، آئندہ اس کی سرپرستی اور نگرانی کا تعلق مولانا گنگوہی سے جو پیدا ہوا، اسی کا تمثّل بشکل نکاح ہوا تھا۔

درد کے اس افسانہ، اور غم کی اس کہانی کو ختم کرتے ہوئے اس کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ باوجود کافی تلاش اور جستجو کے اس کا علم نہ ہو سکا کہ سیدنا الامام کے جنازے کی نماز کس نے پڑھائی۔ حضرت مولانا گنگوہی کے ہوتے ہوئے خیال تو یہی گذرتا ہے کہ کسی دوسرے کو کیسے آگے بڑھایا گیا ہوگا، لیکن نہ کوئی تحریری شہادت ہی اس سلسلہ میں اب تک مجھے ملی ہے، اور نہ بزرگوں سے کوئی سماعی روایت مجھ تک پہنچی ہے، نیز ان بزرگوں کے ناموں کا بھی پتہ نہ چل سکا، جو "آخری خواب گاہ" میں "بالین آسائش" پر لٹانے کے لئے مرقد انور میں اترے تھے، مصنف امام کے ان الفاظ سے کہ

(بسلسلہ صفحۂ گذشتہ) دین ہے، دیکھا جائے تو سیدنا الامام الکبیر کی پوری زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی فرمان کے مطابق گذری ۱۲

[۱] تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ حضرت گنگوہی فرماتے تھے کہ "میں نے خواب میں دیکھا کہ مولانا محمد قاسم صاحب عروس (دلہن) کی صورت میں ہیں اور میرا ان سے نکاح ہوا" ص۲۸۹ خواب حالانکہ کھلا ہوا تھا، حضرت گنگوہی نے خود ہی تعبیر میں فرمایا تھا کہ ان کے بچوں کی تربیت کرتا ہوں۔ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پانے والے طلبہ بھی ان بچوں میں شریک ہیں۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ بزرگوں کی بزرگی کی پیمائش کے عارضہ میں مبتلا ہونے والوں نے اس خواب سے بھی پیمائش کے گز یا فیتہ کا کام لینا چاہا، اللہم اغفرلہم ۱۲

"اس خزانہ خوبی[1] کو سپرد زمین کر دیا، اور ہاتھ جھاڑ کر چلے آئے" صفحہ ۱۴۶

کچھ ادھر دھیان جاتا ہے، یا جا سکتا ہے کہ اتارنے والوں میں دوسروں کے ساتھ غالباً ہمارے مصنف امام مولٰنا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ صدر اول دار العلوم بھی تھے، اگرچہ قطعی طور پر ان الفاظ کا مدلول یہ نہ ہو، لیکن ظاہر الفاظ اس فقرے کے کچھ اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

بہر حال دار العلوم دیوبند کی موجودہ عمارتوں سے بجانب شمال کچھ فاصلہ پر پلکھنوں[2] اور اسی قسم کے دوسرے تناور گھنے درختوں کی چھاؤں میں حکیم مشتاق احمد دیوبندی مرحوم کے موقوفہ گورغریباں میں لاتعداد قبور کے درمیان سیدنا الامام الکبیر حضرت مولٰنا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا خام، "کلیۃً" خام، صرف مٹی کا مزار پایا جاتا ہے بعد کو دوسری نمایاں میتیوں کے ساتھ آپ کے بالین مزار پر پتھر کی ایک لوح نصب کر دی گئی ہے، جس میں حضرت والا کا اسم مبارک تاریخ وفات کے ساتھ کندہ ہے، باہر سے دیکھنے والے صرف اسی لوح مزار سے آپ کی اس آخری خواب گاہ کو پہچانتے ہیں۔ لیکن باطنی شعور کی بیداری سے کچھ بھی حصہ جن کو ملا ہے، ان ہی سے پوچھئے کہ وہاں وہ کیا پاتے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ سپہر پیما گنبدوں، فلک بوس قبوں میں بھی شاید آج سکینت و طمانینت کی خنکیاں مشکل ہی سے میسر آ سکتی ہیں۔ جنھیں ان ہی کچی خام سادہ قبروں والے اس قبرستان میں پانے والے پاتے ہیں، خصوصاً سیدنا الامام الکبیر کا مرقد پاک جسے دیکھ کر بے ساختہ حماسی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

---

[1] مصنف امام نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ منجملہ دوسرے تاریخی مادوں کے "خزانہ خوبی" بھی ایک مادہ تاریخ ہے ۱۲

[2] میں نے اپنے متعدد بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت والا کے دفن ہی کے روز حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ نے حضرت کے اس مزار پر یہ پلکھن اور گولر کے درخت نصب کئے اور اسی دن دار العلوم کے بڑے احاطہ میں مولسری کے دو درخت لگائے جو آج تناور درخت کی صورت میں سایہ افگن ہیں، اور یہ احاطہ ہی آج احاطہ مولسری کے نام سے معروف ہے ۱۲
محمد طیب غفرلہٗ

عجبا لاربع اذرع فی خمسۃ	اس چار یا پانچ ہاتھ کے طول و عرض میں تعجب
فی جوفہا جبلٌ اشم کبیر	ہے کہ اتنا اونچا بڑا پہاڑ کیسے سماگیا ۔

کہتے ہیں کہ دفن کرنے والے جس وقت دفن کر رہے تھے، اسی وقت بے ساختہ حضرت شیخ الہند مولٰنا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی زبانِ مبارک سے یہ شعر نکل پڑا، روتے جاتے تھے، اور کہتے جاتے تھے،

مٹی میں کیا سمجھ کے دباتے ہو دوستو
گنجینۂ علوم ہے، یہ گنج زر نہیں،

(اس کے بعد یہ گنجینۂ علوم (شیخ الہندؒ) بھی اسی جگہ دفن ہو کر اپنے اصلی معدن سے جا ملا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ محمد طیب غفرلہٗ)

اس وقت تو علوم کا ایک ہی گنجینہ یہاں دفن کیا گیا تھا، لیکن اب خدا ہی جانتا ہے کہ علم واخلاص، ایمان وعرفان کے کتنے خزانے اب تک اسی سرزمین میں محفوظ ہو چکے ہیں۔ اور کتنے پردیسی، غریب الوطن، ابناء السبیل کو رحمت کے اس جوار میں پہنچ کر آسودگی میسر آچکی ہے۔[۱] ونعم ما قیل ؎

---

[۱] ارواح طیبہ میں نقل کیا ہے کہ کسی نے سیدنا الامام الکبیرؒ سے ایک دفعہ پوچھا کہ بزرگوں کے قریب دفن ہونے کا کیا فائدہ ؟ کہ ہر شخص کو اپنی ہی نیکی کام آتی ہے، پوچھنے والے صاحب اس وقت حضرت کو پنکھا بھی جھل رہے تھے۔ فرمایا کہ تم اس مجمع میں پنکھا کسے جھل رہے ہو، کہا کہ آپ کو، پنکھا کافی بڑا تھا، دوسروں کو بھی ہوا پہنچ رہی تھی، اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ یوں ہی حق تعالٰی کی رحمت ومغفرت کے جھونکے جب چلتے ہیں، تو مقصود کوئی ہو، لیکن آس پاس والے بھی اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ (تلخیص از ارواح ثلاثہ ص۱۸۱) مشہور حدیث ھم القوم الذین لا یشقی جلیسھم (اہل اللہ وہ لوگ ہیں جن کا ہم نشین کبھی نامراد نہیں ہوتا) حکیم الامت تھانوی نے اس روایت کو تائیداً پیش کرتے ہوئے سخاوی کی مقاصد حسنہ کی اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے جس میں حکم دیا گیا ہے کہ "اپنے مُردوں کو نیک صالح لوگوں کے درمیان دفن کیا کرو" مگر اس روایت کا ایک راوی سلیمان بن موسیٰ مجروح اور ناقابل اعتبار ہے۔ کچھ بھی ہو ہندوستان میں تو گورِ غریباں کا اطلاق (باقی اگلے صفحہ پر)
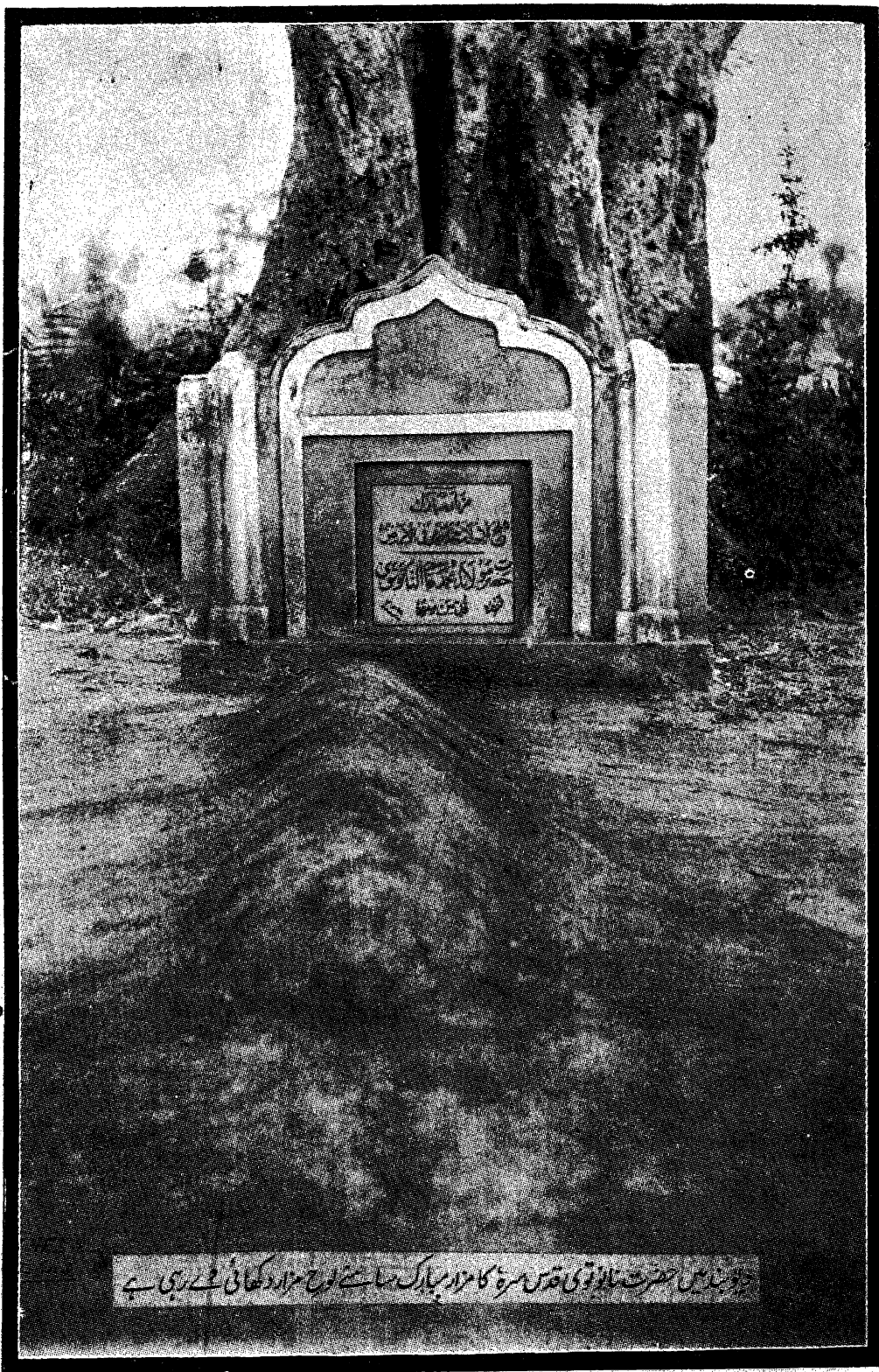
دیوبند میں حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کا مزار مبارک سامنے لوح مزار دکھائی دے رہی ہے

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے۔ راتیں اسکی ہیں
جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

کون جانتا ہے کہ باطنی فیض رسانی کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔

کچھ بھی ہو سیدنا الامام الکبیر بظاہر اب ہم میں نہیں ہیں۔ لیکن کہنے والے نے کہا تھا،

لعمرك ما وارى التراب فعاله
لكنها وارى ثيابا واعظما

آج ہند ہی نہیں، بیرون ہند کی کتنی اسلامی آبادیاں آپ ہی کی جلیل دینی و علمی خدمات کی روشنیوں سے جگمگا رہی ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ سمجھنے والوں کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، لیکن اللہ کی راہ میں قتل کے بعد طاری ہونے والی موت سے مرنے والوں کو قرآن کی نص قطعی میں حکم دیا گیا ہے کہ نہ ان کو مردہ کہا جائے، اور نہ مردہ سمجھا جائے، بلکہ یقین دلایا گیا ہے کہ وہ احیاء اور زندہ ہیں، تو جس کی ساری زندگی ہی اللہ ہی کی راہوں پر چلنے میں صرف ہوئی، جب تک زندہ رہا، اسی راہ پر چلتا رہا، اور وفات بھی اس کی جس وقت ہوئی، وہ اسی راہ پر رواں دواں تھا، ایسی صورت میں کیوں اصرار کیا جاتا ہے کہ اس کی "موت" کے بعد ہم اس کو مردوں میں شمار کریں، یاد ہوگا کہ ایک دفعہ نہیں، متعدد مواقع پر مشاہدہ کرنے والوں نے وفات کے بعد دیکھا کہ

(گذشتہ صفحہ سے) ان مقبروں پر کیا جاتا ہے، جہاں آبادی کے پس ماندہ غریب لوگوں کے مرنے دفن ہوا کرتے ہیں۔ لیکن عربی محاورے کی رو سے غریب مفلس کو نہیں، بلکہ اجنبی مسافر کو کہتے ہیں مشہور حدیث ہے بدء الاسلام غریبا وسیعود غریبا فطوبیٰ للغرباء کا مطلب بھی یہی ہے کہ شروع میں بھی اسلام اور اسلامی زندگی سے لوگ ناآشنا تھے، بعد کو بھی ناآشنا ہو جائیں گے۔ مبارک وہی لوگ ہیں جو ناآشنائی کے ان دنوں میں اسلامی زندگی کی وجہ سے سوسائٹی میں اجنبی بن گئے ہیں۔ اس لحاظ سے سیدنا الامام الکبیر کی وصیت کے مطابق صحیح معنوں میں "گور غریباں" کا مصداق دیوبند کا یہ گور غریباں ہی ہو سکتا ہے۔ ایک جگہ اتنے پردیسی مسافر خدا جانے کس کس ملک اور علاقے کے یہاں اب تک دفن ہو چکے ہیں اور آئندہ ہوں گے۔ فطوبیٰ للغرباء ۱۲

"مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جسد عنصری کے ساتھ میرے پاس
تشریف لائے تھے" ۱۸۵ ارواح ثلاثہ

یہ مولانا رفیع الدین سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کا بیان ہے۔ تفصیل اس واقعہ کی اپنے محل پر گذر چکی ہے، اسی طرح مدرسہ کے وظیفہ سے قانونی طور پر محروم رہ جانے والے طالب علم کا قصہ بھی سنا چکا ہوں۔ جن کے سامنے بھی کچھ اسی قسم کی صورت پیش آئی تھی۔ ان کے سوا بھی دوسرے ذرائع سے جو روایتیں مجھ تک پہنچی ہیں، ان کے ہوتے ہوئے، ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ ان منامات و مبشرات کا بھی ذکر کیا جائے، جو عموماً اس قسم کے بزرگوں کی وفات کے بعد مناسبت رکھنے والے نفوس کو دکھائے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ کی بھی بعض چیزوں کا بعض مواقع میں ذکر کر بھی چکا ہوں۔ جن میں سب سے درد انگیز خواب حضرت والا کے صاحبزادے حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ اولیٰ کا تھا۔ جس میں منجملہ اور اجزار کے انہوں نے خواب ہی میں دیکھا کہ ہمارے مصنف امام مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ دکھایا گیا تھا کہ رنگ رنگ کے پھولوں سے بھرے ہوئے ایک پلنگ پر سیدنا الامام الکبیر آسمان سے ان کے گھر میں اتر آئے گھر کے لوگ سب جمع ہیں۔ سیدنا الامام الکبیر ان کو خطاب کر کے صبر کے مسئلہ پر تقریر فرما رہے ہیں، صبر کی اس تلقین پر دیکھا کہ آگے بڑھ کر مولانا محمد یعقوب صاحب حضرت والا سے عرض کر رہے ہیں کہ

"حضرت ہم لوگوں نے بہت صبر کیا، مگر جس وقت عائشہ اور ہاشم نظر
پڑتے ہیں، صبر نہیں ہو سکتا"

عائشہ حضرت والا کی سب سے چھوٹی صاحبزادی کا نام ہے، وفات کے وقت ان کی عمر کل چار سال کی تھی، اور ہاشم آپ کے چھوٹے صاحبزادے کا نام تھا۔ جن کی عمر اس وقت کل آٹھ سال کی تھی۔ کم عمری ہی میں بمقام مکہ معظمہ جن کا انتقال ہوا، خواب میں دیکھا گیا کہ حضرت

حضرت حاجی اِمداد اللہ قدس سرہٗ کا خط جو اُنھوں نے حضرتِ نانوتویؒ کی تعزیت میں مولانا رفیع الدین صاحب کو مکہ مکرمہ سے لکھا

[illegible]

مولانا محمد یعقوب صاحب کے کہنے پر سیدنا الامام الکبیر نے جواب میں فرمایا

"صبر تو ایسے ہی وقت ہے"

اور اسی قرآنی وصیت، حکیمانہ و عارفانہ فقرے پر اپنی اس کتاب کو فقیر بھی ختم کرتا ہے۔

فالحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات

فان أبك ابك علی فاجع

وان یک صبرٌ فمثلی صبّرٌ

سید الانبیاء والمرسلین، محبوب رب العالمین، خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روپوشی پر امت صبر کر چکی ہے، آپ کے جانباز فدائیوں کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ رہتی دنیا تک جاری ہی رہے گا، ہم میں جب وہ آئیں گے تو ہم شکر کریں گے، اور اپنے اپنے وقت کو پورا کر کے جہاں سے آئے تھے جب وہیں چلے جائیں گے تو ہم صبر کریں گے، اللہ کے ان برگزیدوں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ان راستباز مخلص و وفادار عشاق و خادمین کی پاک روحوں کو سلام پہنچاتے ہوئے، ان ہی الفاظ کو دہراتے ہیں جو ہمیں سکھائے گئے ہیں۔

انتم لنا سلف ونحن بالاثر، اتاکم ماتوعدون، غدا موجلون، وانا انشاء اللہ بکم لاحقون، یرحم اللہ المتقدمین منا والمتاخرین

آپ لوگ ہمارے سلف ہیں، ہم آپ کے پیچھے ہیں، جس چیز کا آپ سے وعدہ کیا گیا تھا، وہ آگیا، کل (اٹھنے کے لئے) وقت مقرر کیا گیا ہے، ہم بھی آپ کے ساتھ آکر ملنے والے ہیں،

اللہ رحم کرے ان لوگوں پر جو ہم سے پہلے گذر گئے اور ان پر بھی جو بعد میں گزریں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

کہف الایمان گیلان (بہار)

یوم الاثنین (روز دوشنبہ) ۲۲ سنہ ۱۳۷۲ھ رجب المرجب - ۶ راپریل سنہ ۱۹۵۳ء

مراثی و قصائدِ تعزیت

اس سلسلہ میں کاغذات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والا کے مرثیے بیشمار لکھے گئے، جن کا تذکرہ تو ملتا ہے مگر یہ قصائد نہیں ملتے۔ ناچار صرف وہ قصائد درج کئے جاتے ہیں جو مطبوعہ یا مخطوطہ دستیاب ہوئے۔ ان میں اردو کے قصائد میں حضرت مولٰنا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اور حضرت اقدس شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قصائد اور فارسی میں حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولٰنا محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند (حفید رشید حضرت نانوتوی قدس سرہٗ) کے قصائد، اور آخر میں عربی کا ایک مرثیہ از حضرت مولٰنا ذوالفقار علی صاحب رحمہ اللہ درج کیا جا رہا ہے۔

قطعۂ تاریخ وفات

قبلۂ اربابِ دین کعبۂ اصحابِ یقین حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ بانی و سرپرست مدرسہ اسلامیہ دیوبند کہ بتاریخ ۴ جمادی الاولیٰ یوم پنجشنبہ وقت صلوٰۃ ظہر ۱۲۹۷ھ کو دار آخرت کی طرف رحلت فرمائی۔

(از نتائجِ طبع مولوی فضل الرحمٰن صاحب منبر ملا سلمہٗ)

وہ غم ہے قاسمِ بزمِ ہدا کی رحلت کا	کہ جرعہ نوشِ الم جس سے ہر دروننہ ہے
یہ ایسا غم ہے کہ جس غم سے بزمِ عرفاں کا	مثالِ خمِ فلک جام واژگونہ ہے
کچھ اک زمیں ہی نہیں زرد رنگ اس غم سے	لباسِ چرخ بھی ماتم میں نیلگونہ ہے
ہے حامیانِ شریعت کو گر غم بے حد	تو سالکانِ طریقت کو اس سے دونہ ہے
کہاں ہے مدرسۂ دیں کا حامیِ برحق	کہ ملکِ علم و عمل اس بغیر سونہ ہے
نہ پوچھ حالِ دلِ زارِ تشنگانِ علوم	کہ ان کی زیست ترے ہجر میں جگونہ ہے
کیا ہے شعلۂ ہجراں نے گر جگر کو کباب	تو آتشِ غمِ فرقت نے دل کو بھونا ہے
مگر مزارِ مقدس سے تیرے اے خوش خو	ترے فدائیوں کو صبر ایک گونہ ہے

سرِ الم سے لکھی فضل نے سنینِ وفات

وفات سرورِ عالم کا یہ نمونہ ہے

۱۲۹۷ھ

مرثیہ حضرتِ نانوتوی مشتمل بر کیفیت اجراءِ دار العلوم دیوبند

جس کو حضرت مولانا شیخ الہند مرحوم نے جلسہ منعقدہ ۲۰ صفر المظفر ۱۳۲۴ھ میں سنا کر حضارِ مجلس کو مضطرب و بے قرار بنا دیا تھا۔

ہیں رضن اور محن دونوں جہاں میں توام ‏ حکمتِ حق کا ہے دونوں میں نرالا عالم

رحمت و فضل خدا جب ہے غضب پر سابق ‏ کیوں نہ پھر قہر کو اس کے کہیں لطف و کرم

اس کی آغوش غضب میں ہیں ہزاروں رحمت ‏ اُس کے ہر لطف میں ہیں سیکڑوں الطاف و کرم

فضل سے اس کے کسی وقت نہ ہونا مایوس ‏ خواہ پیش آئے مسرت تجھے اور خواہ الم

رحمت حق کی ہے تمہید سمجھ او ناداں ‏ پیش دنیا میں جو کچھ آتا ہے اندوہ و الم

انقلاباتِ جہاں واعظِ رب ہیں سُن ‏ ہر تغیر سے صدا آتی ہے فَافْهَم فَافْهَم

للہ الحمد میری جان اور ان شاء اللہ ‏ مرغِ ایمان کی ہیں بازوئیں دو مستحکم

دور اندیش وہی ہے کہ مصائب کے عوض ‏ ہو کے خوش مرضیِ مولیٰ کی کرے بیع سَلَم

جزر و مد بحرِ حوادث کا بچشم حق بیں ‏ طرۂ شاہد تقریر کا ہے پیچ و خم

گردشِ دہر دکھاتی ہے ہمیں آنکھوں سے ‏ کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ کا نقشہ ہر دم

کل کی ہے بات کہ تھی جہل کی گھن گھور گھٹا ‏ جس طرف آنکھ اٹھاتے تھے محیطِ عالم

آب حیواں کی طرح علم ہوا تھا مخفی ‏ ظلمت جہل سے مخلوق تھی اَعمیٰ و اَصَم

رحمتِ حق ہوئی حامی تو یکایک اٹھے ‏ چند مردانِ خدا باندھ کے صف ٹھوک کے خم

یوسفِ علمِ شریعت کے خریدار بنے ‏ جمع کر کے سرِ اخلاص سے معدود دِرَم

سلسلہ ڈالا فقیرانہ بنام ایزد ‏ کورده[۱] میں کہ جہاں بیٹھے ہیں ارباب ہمم

شوق کہتا تھا بڑھو ضعف کہے تھا ٹھیرو ‏ ناتوانوں کا تھا کیا کہیے عجب ضیق میں دم

اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ اک مردِ خدا[۲] ‏ آ رہا تیز روی سے ہے لئے ساتھ عَلَم

[۱] مراد دیوبند [۲] مراد حضرت نانوتوی رح

بے نیازی و توکل رخِ روشن سے نمود — قطع منزل کے لئے دونوں قدم تیغ دو دم

کس بلا کی تھی نظر پڑتے ہی جس کی فی الفور — پڑ گئی جان میں جان آ ہی گیا دَم میں دم

ناتوانوں کو مِلا اس کی حمایت سے یہ دور — زینۂ بامِ ترقی پہ بڑھا سب کا قدم

تھی نرالی ہی کچھ اس مردِ صفا کی سج دھج — تھے عجائب کچھ اس شیرِ خدا کے دَم خَم

گاڑ کر اس نے علَم ایک ندا کی ایسی — یک بیک چونک پڑے اہلِ مَدر اہلِ خیَم

اس کی آواز تھی یا بانگِ خلیل اللّٰہی — کہہ کے لبیک چلے اہلِ عرب اہلِ عجم

عقل و انصاف کا جس سر میں ذرا بھی تھا اثر — ذوقِ علمی کا تھا جس سینہ میں تھوڑا سا بھی دم

دین کا ذرہ بھی تھا قلب میں جس کے مُوْدَعْ — خیر کا شمّہ بھی تھا جس کے مقدّر میں رقم

باندھ کر حسبت کمر کہتے ہوئے نَحْنُ مَعَکْ — جس جگہ اُس یم رحمت کا پڑا نقشِ قدم

اس مربی دل و جاں کی مسیحائی سے — علمِ دیں زندہ ہوا جہل نے لی راہ عدم

ابرِ علم و عمل و فضل کا بادل برسا — جس جگہ اس یم رحمت کا پڑا نقشِ قدم

جہل کے جب سبھی کہنے لگے اِحسَا اِحسَا — چل دیا پاؤں دبے چپکے سے با بختِ دژم

علم کو لا کے ثریا سے ثرٰی پر رکھا — آنکھوں سے دیکھ لیا عَلَّمَ مَا لَمْ یَعْلَمْ

دولتِ علم سے سیراب کیا عالم کو — قاسمِ علم بھلا کیوں نہ ہو پھر اس کا عَلَمْ

اس کی آواز تھی بیشک قُمِ عیسیٰ کی صدا — جس کے صدقہ سے لیا علم نے دوبارہ جنم

طائرِ علم شریعت کے لئے یہ دِیْبَنْ — برکتِ حضرتِ قاسم سے ہے مامون حرم

سلسلے علم کے امصار و قرے تک جاری — اس کی ہمت سے ہوئے بل بے ترا فیض اعم

جملہ اعیان و اکابر تھے جو سلو میں اس کی — اس کی شوکت کو پہنچتی تھی کہاں شوکتِ جَم

یک بیک حکمتِ باری نے جو پلٹی کھائی — چل دیئے چھوڑ کے یہاں سب کو سوئے باغِ ارم

لوٹتے آگ پہ تھے حضرتِ یعقوب ورفیع — خون آنکھوں سے بہاتے تھے رشیدِ عالم

دیکھ کر حضرت امداد کی زاری کو ملک — پر سمیٹے ہوئے کہتے تھے الٰہی اِرْحَمْ

اہلِ علم و اہلِ ورع خاص، عوام عالم ۔۔۔ سب نے تقسیم کیا پر نہ ہوا کم یہ غم

فرقِ درجات کا قصہ تو جدا ہے لیکن ۔۔۔ عام تھا عالمِ اجسام میں اس کا ماتم

متزلزل ہوئے سب مدرسہ کے رکن رکین ۔۔۔ ہل گئے ہائے غضب سلسلۂ خیر کے تھم

علم آتا تھا نظر ایک یتیم بے بس ۔۔۔ اہل علم آہ تھے مایوس بچشمِ پُر نم

قاسمِ علم چلے علم بھی لو ساتھ چلا ۔۔۔ کس کو تھاموگے کہو پکڑوگے کس کس کی قدم

ایک کا کرنا سفر دوسرے کا عزم سفر ۔۔۔ جانِ عالم کیلئے دونوں تھے سوہان الم

ہوگیا سب کو یقین باندھ لیا سب نے خیال ۔۔۔ سلسلہ علم کا بس ہوگیا درہم برہم

اسی مایوسی و مجبوری و حیرانی میں ۔۔۔ مجتمع ہو کے اکابر نے بچشم پُر نم

حضرت مرشدِ عالم[عہ] سے تمنا یہ کی ۔۔۔ آپ اب اپنے تصرف میں لیں یہ کار اہم

غایتِ خلق سے فرمایا کہ تمنا ہوں میں ۔۔۔ باقی ہر حال میں ہوں ساتھ تمہارے منضم

چند کلمے کہے نرمی سے تسلی آمیز ۔۔۔ ہوگئے زخم رسیدوں کے جگر کو مرہم

ہائے وہ نیچی نظر ہائے وہ شیریں الفاظ ۔۔۔ کس غضب کے تھے کہ سب دور ہوئی انکی نم

آپ کی پاک توجہ سے ہوا سب کو سکون ۔۔۔ علم کے اکھڑے ہوئے جم گئے واللہ قدم

کام اس مدرسہ کا فضل و کرم سے اسکے ۔۔۔ الغرض رو بترقی ہی رہا ہر ہر دم

مذہبی جتنے سلاسل تھے رہے سب جاری ۔۔۔ کام کوئی نہ رکا سہل تھا وہ یا اہم

بعد چندے ہوا نیرنگیٔ قدرت کا ظہور ۔۔۔ یعنی یعقوب شد فیع ہر دو وزیر اعظم

ہو کے مشتاق لقا پہنچے یکے بعد دگر ۔۔۔ خدمت قاسم خیرات میں شاد و خرم

دست و پا بھی لو چلے سر تو تھا پہلے ہی گیا ۔۔۔ قلب بس باقی رہا یعنی رشید عالم

وہ بھی مجروح ستم دیدۂ ہجر احباب ۔۔۔ جرعہ نوش ستم و دُرد کش ساغر غم

اسی اندوہ و غم و یاس میں سبحان اللہ ۔۔۔ رحمت حق ہوئی مبذول بحال عالم

بھر دیا قلبِ مقدس میں تمام عالم کا ۔۔۔ درد و غم خیر و صلاح خوب ملا کر باہم

[عہ] مراد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رح

خاص کر تربکۂ قاسم کی محبت۔ واللہ | سب طرح اس دل اقدس میں ہوئی مستحکم
سب کی الفت پہ تھی اسکی ہی محبت غالب | سب غموں پر جو تھا ممتاز یہی تھا وہ غم
پھر تو کیا تھا دی عدا نے وہ ترقی انکو | دیکھ لیں آپ کہیں اپنی زباں سے کیا ہم
پوچھئے کیا ہوو ماغوں کا ہمارے احوال | ہم غریبوں کا زمیں پر نہیں پڑتا تھا قدم
نہ رُکا پر نہ رکا پر نہ رُکا پر نہ رُکا | اس کا جو حکم تھا تھا سیف قضائے مبرم
نہ چلا کوئی فساد ایسا کہ پاؤں نہ کٹے | فتنہ نے سر نہ اٹھایا کہ ہوا ہو نہ قلم
کلفتیں جھیلیں سبھی پر نہ ہوا چین بجبیں | دقتیں دیکھیں ٹلا اپنی جگہ سے نہ قدم
دشمن و دوست کے چہرے میں تفاوت تھے عیاں | سر سوں پھولی تھی وہاں اُسنے ملا تھا عدم
سب مریضوں کے لئے ایک شئے ہی تھا آثار | سیکڑوں زہر تھے تریاق تھا بس اسکا دم
قاسم و حضرتِ امداد کو مرنے نہ دیا | بلکہ زندہ ہی رکھا سب کو علی وجہ اتم
مُردوں کو زندہ کیا زندوں کو مرنے نہ دیا | اس مسیحائی کو دیکھیں ذری ابن مریم
ہائے غم ہائے ستم ہائے غضب ہائے الم | آج اُس سے بھی ہوا دیکھ لو خالی عالم
آگے کہنے کی ہے کچھ بات نہ سننے کی تاب | لب تلک آتا ہے لیکن یہ مقولہ پیہم
رحم بر خستہ نسیم ہیچ نکردی رفتی | ایکہ کفش کف پائے تو بود تاج سرم
آج تو قاسم و امداد سبھی مرتے ہیں | اس کا کیا ذکر ہے برباد ہوئے تم یا ہم
منتظر بیٹھے ہیں اب ہم پہ گذرتا کیا ہے | قہر کا خوف ہے پر ساتھ ہے امید کرم
تو رحیم و ملک و بار ہے سلّم سلّم | ہم جہول اور زیاں کار ہیں ارحم ارحم
اے اسیرانِ غم قاسم خیر و برکات | دے فقیران سیر کوئی رشید جانم
پیروی کرتے رہو سبھی کو ہاتھوں سے نہ دو | بدے یا درے یا قدمے یا بالقلم

بے نمک ہیں مرے اشعار مگر تلخ نہیں،
خالی از درد نہیں گرچہ ہیں لشٹم پشٹم،

ازافادات

حضرت شیخ المحدثین مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی قدس سرہٗ

در تاریخ وفات

بحر العلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہر چشم مثلِ ابر ہے کیوں اشکبار حیف	ہر سینہ مثلِ لالہ ہے کیوں داغدار حیف
کس کی لگی ہے یہ نظرِ بد جہان کو	دم میں ہوئی خزاں سے مبدل بہار حیف
ہے کیا سبب جہاں میں آتا نہیں نظر	جز آہِ دردناک و دمِ شعلہ بار حیف
ہر ایک کی زباں پہ ہے جاری دعائے مرگ	آتا نظر ہے ہر کوئی زار و نزار حیف
زیب جبیں ماہ مبیں کیوں ہے داغدار	زخمی جگر ہے کیوں گہر آبدار حیف
مسکن پذیر دل میں ہے کیوں یاس و اضطراب	صبر و سکوں سے آتی ہے کیوں ہم کو عار حیف
آنکھوں میں جوشِ اشک ہے سینہ میں درد ہے	دل میں غم و الم ہے زباں پر ہزار حیف
مونس الم رفیق فغاں غمگسارِ غم	ہمدرد درد ہمنفس اف یارِ غار حیف
سو ٹکڑے ٹکڑے سینہ ہوا چاک چاک اف	دل پارہ پارہ جامہ ہوا تار تار حیف
یہ زندگی ہے یا کوئی طوفان مرگ ہے	غم جی میں اشک آنکھ میں دل میں غبار حیف
کیسی خوشی کہاں کی ہنسی کیا نشاط و عیش	وردِ زبان اب تو ہے لیل و نہار حیف
دشنہ کا کیوں گلو کو ہے اس درجہ اشتیاق	خنجر پہ غش ہے کیوں جگرِ بے قرار حیف
جینے پہ جان دیتے تھے ہم کل کی بات ہے	زہرآبِ مرگ آج ہے کیوں خوشگوار حیف
کل تک تو آرزو تھی ہمیں عمرِ خضر کی	ہر دم اجل کا آج ہے کیوں انتظار حیف

رشکِ خزاں بہار ہوئی دشمنِ نشاط — محسود مرگ زیست ہوئی غمگسار حیف

یہ کون اٹھ گیا ہے کہ جی بیٹھا جائے ہے — یہ کون چھپ گیا کہ ہے حشر آشکار حیف

خورشیدِ علم آج ہوا کون ساغروب — عالم تمام کیوں نظر آتا ہے تار حیف

کس خاکسار کا ہے یہ ماتم کہ جائے اشک — برسے ہے چشمِ دہر سے بہم غبار حیف

کس ضابط و صبور کا شیون ہے یہ کہ آہ — سینہ سے لب تک آتی نہیں زینہار حیف

جو باعثِ نشاطِ دلِ ناصبور تھا — روتے ہیں اس کی ہجر میں اب زار و نزار حیف

ہر بات جس کی مایۂ صبر و شکیب تھی — عالم ہے اس کے ہجر میں اب بیقرار حیف

جب باعثِ حیات ہی ہو موجبِ ممات — اللہ کیا کرے دلِ امیدوار حیف

وہ آج بار دوشِ احبا ہے حسرتا — جو ڈالتا کسی پہ نہ تھا اپنا بار حیف

عالم میں جس کا مثل عدیم الوجود تھا — لو اٹھ گیا جہان سے وہ کوہِ وقار حیف

محروم زیست قاسمِ بزمِ ہدے دریغ — آغوشِ گور عارفِ شب زندہ دار حیف

تقریر دلپذیر ہو جس کی غذائے روح — وہ لقمۂ اجل بستمِ روزگار حیف

عیسیٰ دم اور صرصرِ مرگ اے فلک دریغ — گنجِ علومِ وہبی و کنجِ مزار حیف

موسائے وقت و سحرِ اجل وا مصیبتا — خضرِ زمان و گوشہ نشینِ حصار حیف

یوسف لقا و چاہِ لحد ہمدم الحذر — دیوِ قضا و آصفِ دوران شکار حیف

زیرِ زمین طائرِ عرش آشیانہ اف — بالائے چرخ زیب دہ روزگار حیف

بادِ خزان و گلشنِ دین اے زمانہ آہ — برقِ فنا و خرمنِ صبر و قرار حیف

کشافِ علمِ دین ہوا در پردۂ عدم — موجِ قضا ہو کشتیِ عالم سے چار حیف

جانِ جہاں ہو رہنِ عدم وائے بیکسی — پامالِ خاکِ رہ ہو درِ شاہوار حیف

آیا قرار آپ کو بس جا کے زیرِ خاک — اللہ رے غضب ہوسِ انکسار حیف

گردن پہ تیرے خون ہے سارے جہان کا — تیرا بھلا نہ ہو ہوسِ انکسار حیف

سنتے تھے ہے عدم میں نظیر جناب پر — کیوں قصد آپ نے کیا با جسم زار حیف
سو ہاں جہان ہیں آپ کے الطاف جانفزا — بد قسمتی سے نور ہوا ہم کو نار حیف
گنتے تھے ہم بھی جاں نثاروں میں آپ کو — اس دعوئے غلط سے ہیں اب شرمسار حیف
ہیں! آپ زیر خاک ہوں اور ہم بقید زیست — کیا منہ دکھائیں گے تمہیں روز شمار حیف
اس مایۂ حیات کی فرقت میں یا نصیب — ہو پائدار ہستی نا پائدار حیف
ہوتی نہ سخت جانی اگر مونس فراق — تو کام کر چکا تھا غم ہجر یار حیف
ہم دولت وصال سمجھتے تھے لازوال — تھی کیا خبر کہ ہوگا یہ انجام کار حیف
کیونکر جئیں یہ آپ کے خادم بتائیے — امید مرگ ہی نہ ہو گر غمگسار حیف
رنج و فراق و کلفت غم صد مہائے ہجر — لائق اسی عطا کے تھے کیا جاں نثار حیف
بن جائیے اپنے واسطے خضر رہ عدم — آتا نہیں ہے ایسا نظر دوستدار حیف
ہاں اے اجل خدا کیلئے چشم التفات — بے روئے یار زیست ہے اب ہم کو بار حیف
یاں جان بلب ہیں آپ کو اصلا خبر نہیں — ایسا شفیق اور ہو غفلت شعار حیف
وہ قلب جو کہ محو نیاز حضور تھے — اب ان کو تیغ غم سے کریں یوں فگار حیف
پائے جناب جن سے دباتے تھے کل ہیں آج — وہ ہاتھ زیر سینہ و فرق و عذار حیف
وہاں ہم سے خستہ جانوں کی کیا قدر ہو جہاں — غلماں ہوں اور ملائکہ خدمت گذار حیف
وا حسرتا جو آپ کے حلقہ بگوش تھے — پھرتے ہیں آج جوں شتر بے مہار حیف
علم و ذکا سے آپ کے جو بہرہ مند تھے — پھرتے ہیں کوہ و دشت میں دیوانہ وار حیف
پھرتے ہیں آج فکر میں آب حیات کی — کل تھے جو آہ آپ کے نیما ردار حیف
سرگشتۂ تلاش اطبا جو کل تھے آج — فکر مسیح و خضر میں ہیں دل فگار حیف
اب اپنی موت کی ہیں وہ تدبیر سوچتے — جو آپ کی حیات کے تھے خواستگار حیف
ہو آپ کی حیات تلک خاک دسترس — جب اپنی موت ہی پہ نہیں اختیار حیف

پھولا نہیں سماتا ہوں کہتا ہے جب کوئی
کیا اعتبار ہستی بے اعتبار حیف

زیر زمین ہی چل کے رہو ہمدمو کہ ہاں
کچھ لطف زندگی نہیں بے روئے یار حیف

سر پہ ہو کوہِ غم تو تڑپنا بھی ہے محال
نکلیں گے کس طرح مرے دل کے بخار حیف

اب خوابِ وصل ان کو ہے سرمایۂ نشاط
جن کو خیال ہجر بھی تھا ناگوار حیف

[۱] فقر و ہنر کمال و سخا جود و اتقا
دستِ قضا سے ہوں بے سر و پا ہزار حیف

ق ن ما خ و تق
۱۲۹۷ھ

مل [۲] جائیں فضل و علم و عمل اف زمیں میں
پیوند خاک زہد و سخا ہوں ہزار حیف
۱۲۹۷ھ — ۱۲۹۷ھ

[۳] جائیں عدم میں فضل و کرم جود ہائے ہائے
عالم ہو اور ماتم و حسرت ہزار حیف
۱۲۹۷ھ — ۱۲۹۷ھ

گو دم نہیں پہ [۴] نکلے ہے دل سے یہی صدا
پژمردہ آہ ہو گل خنداں ہزار حیف
۱۲۹۷ھ = ۴۴ - ۱۳۴۱

---

[۱] فقر۔ ہنر۔ کمال۔ سخا۔ جود۔ اتقا۔ کے بے سر و پا ہو جانے پر جو الفاظ باقی رہتے ہیں وہ مادہ تاریخ ہیں اور وہ یہ ہیں ق۔ن۔ ما خ۔ و۔ تق۔ ان کے اعداد (۱۲۹۷) ہیں جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے ہجری سنہ کے ہیں ۱۲

[۲] فضل۔ علم۔ عمل۔ زمین کے اعداد (۱۲۹۷) ہیں۔ خاک۔ زہد۔ سخا۔ کے اعداد (۱۲۹۸) ہیں۔ بعد غور خیال میں آتا ہے کہ خاک کو درمیان سے کھود کر پیوند خاک کیا جاتا ہے۔ جب لفظ خاک درمیان سے کندہ کیا جائے گا الف عدارد ہو جائے گا اور ۱۲۹۷ باقی رہ جائیں گے۔ غالباً حضرت کا یہی مقصد ہوگا ۱۲

[۳] مادہ تاریخ کے لئے فضل۔ کرم۔ جود کو عدم کے ساتھ شامل کیجئے۔ عالم۔ ماتم و حسرت۔ کے اعداد (۱۲۹۶) ہیں۔ ایک کی کمی ہے۔ تاریخ وفات کے مادہ میں ایک کی کمی اگر رہے تو معیوب نہیں بلکہ مستحسن ہے جس طرح تاریخ ولادت کے مادہ میں اگر ایک زائد ہو مستحسن ہے۔ یہ مادہ تاریخ غالباً اسی قاعدہ کے لحاظ سے نکالا ہے ۱۲ [۴] دوسرا پورا مصرعہ بتخرجۂ (دم) مادۂ تاریخ ہے۔ ۱۲

مرثیہ حضرت نانوتوی رح

بزبان فارسی

از حضرت مولنا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی

مددے سوز درونم کہ شدم غرق بخون ۔۔۔ رحمے اے گریہ کہ من سوختم از سوز درون
ایں چہ شور است کہ کردست مراگرد جنون ۔۔۔ مرگ بشتاب کہ از زیست بجانم اکنوں

وقت آنست کہ من جامۂ جان چاک تنم
آتشین آہ برین خرگۂ افلاک زنم

فلک تفرقہ پرداز چہ کردی ہے ہے ۔۔۔ باچنیں غمزدگان بازچہ کردی ہے ہے
سخت کج باختی کجبازچہ کردی ہے ہے ۔۔۔ مدبیداد شدہ بازچہ کردی ہے ہے

ساختی بے سروپا بے سروسامانی را
سوختی ز آتش جان سوز مسلمانی را

مرشد و ہادیِ ما شاہ محمد قاسم ۔۔۔ رہ نمایندۂ گمراہ محمد قاسم
بادل روشن و آگاہ محمد قاسم ۔۔۔ رفت زین دار فنا آہ محمد قاسم

حالیا زیستنم مشکل و مردن مشکل
ہر نفس خوردن زخمی و نخوردن مشکل

تا شدہ از سر ما سایۂ ان سرو روان ۔۔۔ روز و شب صبح دمسائیم چو قمری نالان
دور ازان جان جہانیم چو جسم بیجان ۔۔۔ یا چون آن گلہ کہ رفت از سرِ وے آہ شبان

آہ ازین فرقت جاوید کہ پایانش نیست
داد ازین درد روان سوز کہ درمانش نیست

شمع از جمع شد و محفلِ ما شد تاریک ۔۔۔ رفت خور زیر زمیں ارض و سما شد تاریک
ہادیٔ ما بشد و راہ ہدیٰ شد تاریک ۔۔۔ خانہ شرع و طریقت بخدا شد تاریک

بعد ازین کیست کہ زیسان غم اسلام خورد
فکر ایتام کند یا غم ناکام خورد

ہائے آن لطف و عنایات کجا شد ہیہات
ہائے آن حسن اشارات کجا شد ہیہات
ہائے آن رمز و حکایات کجا شد ہیہات
ہائے آن شارح آیات کجا شد ہیہات

وائے بر ما کہ شد از دست چنین دوست دریغ
مغز ما رفت و نماندہ است مگر پوست دریغ

اے غم غمزدگان ہیچ نخوردی رفتی
رحم بر خستہ دلان ہائے نکردی رفتی
گرم جوشیت چنین بود بسردی رفتی
چست و چالاک کنون کہ رہ نوردی رفتی

عجب از خلق کریم تو کہ بے ما رفتی
دوستان با تو کمر بستہ و تنہا رفتی

جان ما بے تو بجانیم تو بے ما چونی
شہر وحشت کدہ شد بے تو بصحرا چونی
ایکہ خورسند بما بودہٴ تنہا چونی
در تہ خاک بگو اے گل رعنا چونی

یاد تو در دل و ذکرت بزبانم جاری ست
زخم ہجران تو بر روح و روانم جاری ست

جامہٴ علم و عمل بر قد زیبائے تو راست
خلعت فقر بہ بالائے نکویت زیباست
چون تو سروے ز گلستان عجم کم برخاست
خود ازین است کہ از رفتن تو حشر بپاست

مردمان اشک خود از بہر تو کردند سبیل
حالیا غیر جمیل است مگر صبر جمیل

ایکہ بر ما بگزیدی ملاءِ اعلیٰ را
ایکہ بر پسپت پسندیدہٴ تو بالا را
ہر کہ بگزاشتہٴ خود تو بغفر ما ما را
غیر ازین نیست کنون روز بان شیدا را

سایہٴ رحمت غفار مبارک شاہا
قربت احمد مختار مبارک شاہا

(از حضرت مولانا محمد طیب صاحب دامت برکاتہم (حفید رشید حضرت نانوتوی قدس سرہ))

فکر حزیں

چند حروف کہ از غوائل حشو و اطناب خالی نہ بمحض حب قلبی نوشتم این چند سطور از صنائع اشعار و بدائع مصارع خالی مگر از درد قلبی و ہیجان عشقی لبریز ہر کہ بیند مرا بدعائے خیر یاد دارد کہ بندہ باین دار فانی بجز دعائے خیر محتاج چیزے نیست ؎

خدارا انتظار احمد ما نیست محمد چشم در راہ شما نیست
محمد از تو مے خواہم خدا را خدارا از تو حب مصطفی را

گلستان علم (دار العلوم دیوبند) ومن بہا

ہمیں گلشن کنوں کو رشک ہند است ہمیں دار العلوم دیوبند است
بمرغان چمن فضلش ہویدا چمن اندر چمن ماراتش پیدا
بہر ہر مرغ خود گوید کہ اُعطی فانی قاسم واللہ یعطی
بماہ ہند آمد ضوء ازیں مہر بر اعدائے چنیں مہرے شود قہر
بارض ہند بے شک آں فلک ہست بچشم ہند انسانش ملک ہست
بذات پاکش رحمت بباری بہ قرب رحمت جانش در آری
بہر سو دین برحق زاں علم شد حکایتہائے شرک و کفر کم شد
جہادے کردہ و دیں را فزودہ کہ شرک و کفر از عالم ربودہ
بہم ایمان و دیں از بس رسیدند ز نو وحشی کفر و بے دینی رمیدند
بعلمی جہل از گیتی رواں شد بیامد حق و باطل از جہاں شد
محمد قاسم الخیرات ذی شان گرفتہ دین برحق رونقے زاں
بباغ دین احمد باغبانست کہ این گلشن بعہدش نوجوانست

شریعت را ہزاراں برعلم کرد
طریقت را بلوح دل رقم کرد

شدہ در شرق و غرب انر وئے فسانہ
جنوب و ور شمال از وئے ترانہ

کہ صیت فضل و فیض او محیط است
چو نور مہر بر عالم بسیط است

انقلاب دہر

وتلك الايام نداولها بين الناس

ہماں گو ہر کہ او بودہ جہانتاب
جہاں از آب فیضش گشتہ بیتاب

بصد حیفم کہ نور مہر رخشاں
نہ ہر ذرہ بود از مہر رخشاں

بافسوسم کہ ابر آب حیواں
نبارد از پئے اطفال بستاں

بفریادم کہ فیض لاتناہی
گزارد تشنہ اندر آب ماہی

خدارا اے وفاداران دلریش
بمن گوشے کہ گویم غم خویش

چہ غم! افسانہ صد درد و ماتم
بہ ہول روز رستاخیز ہمدم

چہ غم! جور فلک ہر صبح و ہر شام
چہ غم! تیر قضا بے وقت و ہنگام

چہ غم! من زندہ و جانم تہ خاک
چہ غم! تن سالم و در سینہ صد چاک

چہ غم! بے چادری و ابر باراں
چہ غم! بے مادری و شیر خواراں

چہ غم! با بینوائی ساز کردن
چہ غم! فریاد بے آواز کردن

چہ غم! ماہی و ریگ گرم و گرما
چہ غم! مفلوج و آب سرد و سرما

چہ غم! جام تہی از بادۂ غم
چہ غم! راہم دراز و زاد رہ گم

چہ غم! روپوشی ایمان و جانم
چہ غم! بربادگی خان و مانم

چہ غم! بے تو جہاں پر نالہ و شور
چہ غم! بے تو ہزاراں زندہ در گور

تو اے مولائیم آخر کجائی
ز ما روپوش بے چون و چرائی

کجائی روز ما را آفتابی   کجائی اے شبم را ماہتابی
کجائی داروئے مطلق کجائی   کجائی مرشد برحق کجائی
کجائی راحت جانم کجائی   کجائی نور ایمانم کجائی
کجائی داروئے دردِ دلِ من   کجائی ساکن آب و گل من
کجائی آنکہ بر تو بود نازم   کجائی ایکہ سویت چشم بازم
کجائی اے سر و سامان مایان   کجائی روح مایاں جان مایاں
کجائی تا ترا خدمت گزارم   بمیرم زیر پایم جاں سپارم
سرم بر زانویت چشم بسویت   کفن از دامنت قبرم بکویت

نہ تختے تا تنِ خاکت فگندند

نہ رازے تاکہ پنہانت پسندند

اگر نوری بخال من قدم زن   اگر خالی بیا در مردم من
اگر خود مرد می در چشم من شو   اگر چشمی بیا در حدقہ ام رو
اگر تنہا یت مقصود باشد   ہزاراں خلوتم موجود باشد
دلم دارم ز دردِ غیر خالی   بیا بنشیں قدم نہ لاابالی
سرے دارم ز سودائے دگر پاک   بیا بنشیں قدم نہ چست و چالاک
نہاں دارم درون سینہ خانہ   بیا بنشیں قدم نہ ما لکانہ
دو چشم و اندرونش پردہ ہایم   بیا بنشیں قدم نہ اے نگاہم
دماغم شد تہی از فکر اغیار   بیا بنشیں قدم نہ مست و سرشار

ولیکن من کجایم تو کجائی

کہ در ویرانۂ قلبم در آئی

تو وُ با ذاتِ حق راز و نیازے   من و بے ذات تو سوز و گدازے

تو ہر دم حصول مقصد خویش
من و چشم پُر آب و سینہ ریش

تو قدوسیان و سبحہ رانی
من و جان حزین و نوحہ خوانی

تو لاہوتیان و اسم اعظم
من و ناسوتیان و نوحہ غم

تو کرو بیان عیش و عشرت
من و ماتم سرا و کُنج وحشت

تو با تو جمالِ جاودانی
من و با من و بال زندگانی

دلے از خاک مولانا برون آ
کہ بینم روئے زیبا قد رعنا

چہ دیدی کز سرم سایہ بُریدی
چہ افتادت کہ تا دامن کشیدی

ز پہلوئے محبان پاک رفتی
جفا کردی کہ زیر خاک رفتی

مرا باشد اگر صد چشم بینا
بود روئے ترا ہر دیدہ جویا

کشائم دیدہ تا روئے تو بینم
گل نظارہ از حسن تو چینم

ترا ہر لحظہ دیدن با خداوند
مرا از دیدن تو دیدہ نے بند

ترا از دیدن ما گشتہ پرہیز
مرا بے تست جام عمر لبریز

دلے اے طیّب غافل ندانی
کہ نورِ مہر را ظلمت بدانی

نہ موتست اینکہ دانی بل وصالست
کہ نزد آشنا افزوں کمالست

دگر نہ موت کامل ارتحالست
کہ از حالے بجالے انتقالست

چو خورشید لیست زیر ابر پیدا
بگیتی روز روشن زاں بہرجا

منور تربتش از فضل خودساز
درِ رحمت بروئے اُو کنی باز

سقی اللہ الکریم ثراہ ھمما
بفیض علے بسیط الارض نعما

ایقاظِ نفسِ خود کہ اصلِ اصولِ معرفت ست

خداوندا بایں مردانِ میداں — کنی انجام من بر خیر و احساں

بکام نفس خود مشغول ہستم — زیاد و ذکر تو معزول ہستم

زمانہ شد بعیش و کامرانی — ندارم ہیچ زادِ جاودانی

نصیحت گوش کن اے نفس دوں کیش — حذر کن بنگر اندر رہ پس و پیش

بیا بشنو کہ دنیا بے ثبات ست — جہانے دیگر از بہر حیات ست

بسا کس اندریں رہ پا نہادند — با سر نہادہ پا نہادند

نگہ کن بر شہان آسماں جاہ — نہ بردند از جہاں جز حسرت و آہ

نگر آنکہ بجمال خوبرویاں — بعالم آنکہ بودہ مشکبویاں

بہارشاں خزاں بگرفت و بگذشت — بسان لالہ بر دل داغ در دشت

نگہ کن بر جمال و حسن یوسف — ہمہ عالم ازو شد در تأسف

ہمہ حسنش سموم مرگ پژمرد — بجز نام گرامی نیست چوں مرد

ببیں بیشیں زمانہ ہا گذشتہ — ہزاراں کس وحید دہر گشتہ

چوں مرگ شاں کشیدہ جان ز اجسام — نماندہ یاد در عالم بجز نام

حذر از محنت دنیا ضرور است — کہ دنیا از وفا پاک است و دور است

بجز نقد گنہ چیزے ندارم — مگر از فضلِ او امید دارم

بحال زار من یارب نظر کن — چو وا ماندم بفضلِ خود گذر کن

بیا طیب ز این و آں گذر کن
بسوئے رحمت و فضلش نظر کن

طیبؔ ابن احمدؒ ابن قاسمؒ

مرثیہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ بزبان عربی

ازحضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی

یا قاسم الخیر من للعلم والدین	اذ ارتحلت وفی ارشاد و تلقین

(ترجمہ) اے قاسم الخیر جب آپ رحلت کرگئے، تو علم، دین، اور ارشاد و تلقین کا کون کفیل ہوگا۔

یا قاسم الخیر من للطارقین ومن	للضارعین مکروب و محزون

(ترجمہ) اے قاسم الخیر اب مہمانوں، بے وسیلہ سائلوں غم زدوں اور بے چینوں کا کون کفیل ہوگا

یا قاسم الخیر اسمع من لکربتنا	یا قاسم الضیر قل من للمساکین

(ترجمہ) اے قاسم الخیر سن تو سہی! اے نقصان کی تلافی کرنیوالے تو ہی کہہ مسکینوں کا کفیل اب کون ہوگا

من للمدارس من للوعظ من لہدی	من للنکات توضیح و تبیین

(ترجمہ) مدارس، وعظ و ہدایت، نکتہ سنجی اور توضیح و تشریح مطالب (یعنی دقیقہ سنجیوں) کا کون کفیل ہوگا۔

من للشریعۃ او من للطریقۃ او	من للحقیقۃ اذ ارسیت فی الطین

(ترجمہ) شریعت، طریقت، اور حقیقت کا محافظ کون ہوگا جبکہ تو زیر زمین مقیم ہوگیا۔

رحلت عنا ولم یوجد عدیلک فی	العلوم والفضل من عرب الی الصین

(ترجمہ) تو ایسے حال میں ہم سے جدا ہوکر عازم سفر ہوا جبکہ علم و فضل میں عرب سے چین تک تیرا کوئی ہمسر موجود نہیں۔

یا عین جودی بدمع غیر منقطع	علی الذی جل من مدح و تابین

(ترجمہ) اے میری آنکھ مسلسل آنسو بہاتی رہ ایسی ذات کے لئے جو لوگوں کی قصیدہ گوئی اور مرثیہ خوانی سے بالاتر ہے۔

کہف الوریٰ حجۃ الاسلام مرشدہ	نجم الھدایۃ رجم للشیاطین

(ترجمہ) (وہ جو) مخلوق کے لئے پناہ گاہ، اسلام کی حجت اور اس کا رہنما، ہدایت کا ستارہ اور شیاطین کے لئے شہاب ثاقب تھا۔

بحر العلوم امام الکون اکرمہ	مبارک الاسم والزیتون والتین

(ترجمہ) تین اور زیتون کی قسم وہ علوم کے بحر بیکراں، کائنات کے امام، ان میں سب سے زیادہ معزز اور بابرکت نام والے تھے۔

لقد مضیٰ صاحبی من فی مصیبتہ	برئت من ذکر اسلاءٍ وتسکین

(ترجمہ) واللہ میرا وہ ساتھی گذر گیا جس کی مفارقت کی مصیبت میں میں تسلی وتشفی کے مرحلہ ہی سے آگے نکل چکا ہوں (کہ اب مجھے کوئی تسلی دے اور میں تسلی پا جاؤں)

من لی بصدر عن الاحزان منقطع	من لی بقلب بصبر غیر مقرون

(ترجمہ) (ا) وہ سینہ کہاں سے لاؤں جو غم واندوہ سے خالی ہو، وہ قلب کہاں سے لاؤں جو صبر سے خالی ہو۔

(ب) کوئی ہے جو میرے لئے ایسے سینہ کا ضامن ہو، جو دوسرے تمام غموں سے خالی یکسو ہو۔ کوئی ہے جو میرے لئے دل بیقرار کا ضامن ہو۔

الیک صبری فشیٔ لیس یشغلنی	عن الخلیل الا یاسلونی بینی

(ترجمہ) اے میرے صبر مجھ سے دور رہ اور اے تغافل میرے پاس سے ہٹ جا۔ (اس لئے کہ کوئی شے مجھ کو اس دوست کی یاد سے غافل نہیں کر سکتی۔

وکیفما ستروہ فی التراب ولا	یکون للشمس من ستروند فین

(ترجمہ) حیرت ہے کہ لوگ اس ذات کو مٹی میں کس طرح چھپا سکے حالانکہ "خورشید" کو نہ تو چھپایا جاسکتا ہے اور نہ اسے دفن کیا جاسکتا ہے۔

وهون البين انی لاحق بکم	اذا ارتحلتم وان اُحیی الحین

(ترجمہ) جب آپ روانہ ہو ہی چکے ہیں تو آپ کی مفارقت کو میرے حق میں اس خیال نے آسان اور ہلکا بنا دیا ہے کہ میں بہرحال آپ سے جا ملوں گا، اگرچہ زمانہ دراز تک زندہ رہوں۔

سقی الالٰہ ضریحاً انت ساکنہ
وَیرحم اللّٰہ مَنْ یمُدُّ بتامین

(ترجمہ) اللہ اس قبر کو سیراب رکھے جس میں آپ سکونت پذیر ہیں اور ان پر خدا کی رحمت ہو جو آمین کہہ کر (اس دعا میں میری) اعانت کریں۔

حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ
سرسید مرحوم کی نظر میں

رسالہ دارالعلوم بابت ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۶ھ مضمون سید محبوب رضوی صاحب

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی وفات پر سرسید مرحوم نے "علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" کی اشاعت مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۸۸۰ء میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون میں حضرت نانوتویؒ کے متعلق سرسیدؒ نے اپنے تاثرات کا جن الفاظ میں اظہار کیا ہے وہ الفاظ معاصرانہ چشمک سے مبرا ہونے کے علاوہ حضرت نانوتویؒ کے علم و عمل اور صلاح و تقویٰ کا جو مقام متعین کرتے ہیں، اسکے متعلق یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ وہ عقیدتمندانہ جذبات کے غلو سے قطعاً پاک ہیں۔

کسی ایسے شخص کا اپنے کسی ایسے معاصر کے بارے میں اظہار رائے کرنا جو اس شخص کے عقائد و افکار اور رجحانات سے شدید اختلاف رکھتا ہو ظاہر ہے کہ کس بے لاگ حیثیت کا حامل ہو سکتا ہے، یہ حضرات ایک دوسرے کو ذاتی حیثیت سے کس نظر سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ تصفیۃ العقائد کی اس مراسلت سے ہو سکتا ہے جو ان حضرات کے مابین ہوئی ہے، اس مراسلت میں سرسید اپنے ایک دوست (منشی محمد عارف صاحب) کو خط میں لکھتے ہیں

"اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لا دیں تو میری سعادت ہے، میں اُن کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا۔"[۱]

متذکرہ بالا مکتوب کے جواب میں سرسید کے ان ہی دوست کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا تھا کہ:

"ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب (سرسید) کی اولوالعزمی اور دردمندی

---

[۱] تصفیۃ العقائد صفحہ ۳ مکتوب سرسید بنام منشی محمد عارف۔

اہل اسلام کا معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہار محبت کروں، تو بجا ہے۔ مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فساد عقائد کو سن کر ان کا شاکی اور اُن کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں[1]۔"

اس مختصر تقریب کے بعد سرسید کا متذکرۂ صدر مضمون درج ذیل ہے :۔

"افسوس ہے کہ جناب ممدوح (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح) نے ۵ اراپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا، زمانہ بہتوں کو رویا ہے، اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا۔ لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشین نظر نہ آوے نہایت رنج اور غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دلّی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم و فضل اور تقویٰ اور ورع میں معروف اور مشہور تھے، ویسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بھی بے مثل تھے۔ لوگوں کو خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحاق صاحب کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے۔ مگر مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ۔

بہت لوگ زندہ ہیں جنہوں نے مولوی محمد قاسم صاحب کو نہایت کم عمری میں دلّی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے۔ انہوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب مرحوم سے تمام کتابیں پڑھی تھیں، ابتدا ہی سے آثار تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے ان کے اوضاع اور اطوار سے نمایاں تھے۔ اور یہ شعر اُن کے حق میں بالکل صادق تھا ؎

[1] تصفیۃ العقائد صفحہ ۶ مکتوب حضرت نانوتوی رح بنام منشی محمد عارف صاحب ۱۲

بالائے سرش زہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

زمانہ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم وفراست میں معروف ومشہور تھے۔ ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل وکمال تھے، اُن کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا اور حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فیض صحبت نے اُن کے دل کو ایک نہایت اعلیٰ رتبہ کا دل بنا دیا تھا۔ خود بھی پابند شریعت اور سنت تھے۔ اور اور لوگوں کو بھی پابند شریعت اور سنت کرنے میں زائداز حد کوشش کرتے تھے۔ بایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا بھی ان کو خیال تھا، انہیں کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لئے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا۔ اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے مسلمانی مدرسے قائم ہوئے۔ وہ کچھ خواہش پیر اور مرشد بننے کی نہیں کرتے تھے۔ لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال ومغرب میں ہزارہا آدمی ان کے معتقد تھے اور اُن کو اپنا پیشوا اور مقتدا جانتے تھے۔

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے۔ مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے۔ ہم مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو خواہ کسی سے خوشی کا ہو، کسی طرح ہوائے نفسانی یا ضد اور عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کہ تھے بلاشبہ للّٰہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے اُس کی پیروی کرتے تھے۔ ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے واسطے تھا، اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا، کسی شخص کو مولوی محمد قاسم اپنے ذاتی تعلقات کے سبب

اچھا یا برا نہیں جانتے تھے بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ برے کام کرتا ہے یا بری بات کہتا ہے، خدا کے واسطے برا جانتے تھے مسئلہ حب للہ اور بغض للہ کا خاص ان کے برتاؤ میں تھا۔ اُنکی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں ہم اپنے دل سے اُنکے ساتھ محبت رکھتے تھے، اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو، بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔

اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو اُن سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے تسلیم کرتے ہونگے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے، اُن کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیز رح سے کچھ کم ہو الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھکر تھا مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحٰق سے بڑھ کر نہ تھا، تو کم بھی نہ تھا۔ درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے اور ایسے شخص کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے لئے جو اُن کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اسکے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے زبانی عقیدت اور ارادت بہت زیادہ ظاہر کرتی ہے ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت و افسوس کے کہہ کر خاموش ہو جائیں یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صاف کر لیں بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگاری کو قائم رکھیں۔

دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگاری ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعہ سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جما رہے ؎

(نقل باصلہ از علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ

مورخہ ۲۴ را پریل ۱۸۸۰ء صفحہ ۴۶۷ و ۴۶۸)

تشنہ کامی اور حسرت وقلق

چوتھی جلد کی تمہید

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔ آج جبکہ سوانح قاسمی کی یہ تیسری جلد پایۂ تکمیل کو پہنچکر شائع ہو رہی ہے افسوس کہ مؤلف سوانح حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی اس دنیائے فانی میں موجود نہیں ہیں۔ آج اُن کے صرف مآثر اور علمی آثار ہی اُن کے وجود کی دلیل ہیں لیکن وہ وجود باخبر خود سامنے نہیں۔ تاہم اگر آثار سے مؤثر کا پہچانا جانا ایک مسلّمہ اور فطری اصول ہے تو مولانا مرحوم کی شناخت میں آج بھی کوئی دشواری لاحق نہیں ہو سکتی۔ آج وہ اپنے محدود جثہ کے ساتھ ہم میں نہیں ہیں، لیکن اپنے غیر منقطع اور لا محدود اثرات کے ساتھ اب بھی ہم میں جلوہ گر ہیں جو بلاشبہ پہلے وجود سے زیادہ قوی اور پائدار وجود ہے جس کے لئے کبھی انتہا و اختتام نہیں۔

مولانا مرحوم سوانح کی یہ تینوں مجلدات مکمل کر کے اپنی حیات ہی میں بھیج چکے تھے۔ دو جلدیں طبع ہو کر اُن کی نگاہوں کے سامنے آچکی تھیں۔ یہ تیسری جلد اُن کے بعد شائع ہو رہی ہے جس کی تمنا لے کر ممدوح رخصت ہوئے۔ سوانح کی ان مجلدات کی تکمیل پر میں نے عریضۂ تشکر لکھتے ہوئے اُس میں عرض کیا کہ آپ نے سوانح قاسمی کے ایک ہزار صفحات لکھ کر بھیجے، اُس کا شکریہ میں کیا ادا کروں پورے علمی حلقے اور قوم کے سارے سنجیدہ طبقے ادا کریں گے اور کرتے رہیں گے البتہ میں شکریہ کو کچھ مؤثر کرتے ہوئے اتنا عرض کروں گا کہ ابھی حضرت سیدنا الامام الکبیر کی حقیقی سوانح آپ نے لکھی ہی نہیں۔ کیونکہ حضرت والا کی حقیقی سوانح یہ نہیں ہے کہ وہ کب پیدا ہوئے کب وفات پائی اور اس درمیان میں کہاں کہاں اُن کی کیا کیا نقل وحرکت ہوئی۔ حقیقی سوانح یہ ہے، کہ انھوں نے اپنے لدنی اور وہبی علوم سے جس حکمت کی بنیاد ڈالی وہ کیا ہے کن اصولوں پر مبنی ہے

اور ذہنی اور علمی دنیا میں اس نے کیا انقلاب پیدا کیا؟ دیوبند کے فضلاء جس حقیقت سے بنے اور بن رہے ہیں ان کی وہ بنیادیں کیا ہیں جو حضرت بانی نے قائم کیں اور ان کے لئے انداز فکر کی ایک ممتاز اور مؤثر راہ ڈالی بلاشبہ آپ نے تاسیس دارالعلوم کی پوری سرگزشت تحریر فرمادی اور وہ اپنی جگہ حق ہے۔ لیکن دارالعلوم کی معنویت کی تاسیس کن لطیف اینٹوں سے کی گئی اُس کی سوانح باقی ہے اور وہی حضرت قاسم العلوم کی اصلی سوانح حیات ہے۔ کیونکہ صورت دارالعلوم کی تاسیس میں کتنے ہی **مقدسین** ان کے شریک اور معاون تھے لیکن دارالعلوم کی اس معنوی اور علمی تاسیس میں جو کام ہوا وہ یقیناً **بلاشرکت غیرے تھا** جس کا نام **"دیوبندیت"** ہے اور آپ ہی **نے خود** رکھا ہے جس کی طرف جلد ثانی میں بسلسلۂ تاسیس دارالعلوم آپ نے اشارے فرمائے ہیں۔ سو جب تک ان اشاروں کی تفصیلات سامنے نہ آئیں۔ تاسیس دارالعلوم کی داستان نامکمل اور سوانح قاسمی تشنہ رہیگی۔

میری اس عرضداشت کو مولانا مرحوم نے محسوس کیا اور اُن کے فکری گوشوں میں یہ منصوبہ اُتر گیا۔ لکھا کہ آپ نے برمحل تنبیہ کی۔ مگر میں کیا کروں کہ موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہوں تاہم جدھر توجہ دلائی گئی ہے وہ ایک حقیقت ہے اور اُس کا حق ہے کہ قلم کو ابھی قلمدان میں نہ رکھا جائے۔ اس لئے میں جیسا بھی ہوں جس حال میں بھی ہوں، اللہ کے بھروسہ پر قلم اٹھاتا ہوں اور حکمت قاسمیہ کے بارہ میں اپنی محدود معلومات کی حد تک سعی شروع کرتا ہوں۔

اس مراسلت کے چند ماہ بعد میرا گیلان جانا ہوا، اور مولانا سے آخری ملاقات ہوئی، خوش تھے اور خوشی سے فرمایا کہ میں نے اُس "حقیقی سوانح" کی تمہید اور تحریر مضامین کے اصولی عنوانات مشخص کر کے لکھنے شروع کر دیئے ہیں۔ ساتھ ہی فرمایا کہ اس دوران میں قلب کا دورہ بھی ہوتا رہا۔ جب دورہ ہوا تو تحریر بند ہو گئی جب ذرا طبیعت سنبھلی پھر کام شروع کر دیا۔ اب تک کا سرمایہ یہ ہے جو مجھے پڑھنے کے لئے عنایت فرمایا۔

تمہید حقیقتاً براعت استدلال کا نمونہ ہے اس میں پورا منصوبہ اپنی اجمالی شکل میں سامنے آگیا ہے۔ آج یہ تحریر ہمارے لئے ایک مستقل حسرت وقلق کا سامان بنی ہوئی ہے جیسے پیاسے کو ایک گھونٹ پلاکر گلاس ہاتھ سے لے لیا جائے تو اُس کی حسرت وقلق کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔ گلاس سامنے نہ کرنے کی صورت میں یاس کی راحت تو میسر تھی لیکن نمونہ سامنے رکھ کر اصل سے محروم ہوجانے کی صورت میں یاس کے ساتھ قلق کی آمیزش بھی ہوگئی اور وہ بھی دوامی۔ اس لئے مصنف مرحوم کی وفات کے صدمہ سے یہ صدمہ دہ چند ہے والی اللہ المشتکی وبہ المستعان وعلیہ التکلان ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

مگر اپنے قلق کو بانٹنے اور کچھ کم کرنے کے لئے میں چاہتا ہوں کہ اس میں اوروں کو بھی شریک کرلوں۔ اسلئے ارادہ ہوا کہ سوانح کے آخری حصّہ میں اس تمہید کو مصنف مرحوم ہی کے الفاظ میں بجنسہ سپرد قلم کردیا جائے تاکہ میرا بار کچھ ہلکا ہوجائے۔

لیکن یہ مقصد بہرحال خودغرضی کا ہے جس کی ناظرین سے معافی چاہتا ہوں مگر اس میں ایک پہلو اصولی بھی ہے اور وہ یہ کہ تمہید کے ان عنوانات خمسہ کو دیکھ کر ممکن ہے کہ کسی صاحب ذوق میں یہ جذبہ ابھر آئے کہ وہ ان میں سے کسی عنوان پر تحقیق اور تحریر کے لئے تیار ہوجائے تو مصنف اور اُن کے علمی پسماندوں کی مدفون شدہ تمناؤں کا خزانہ شاید باہر آجائے۔ بہرحال دنیا میں اہل ذوق فنا نہیں ہوگئے۔ فضلاء دارالعلوم میں بحمداللہ ایسے حضرات ابھی موجود ہیں وماھم الا قلیل کہ اس "حکمت قاسمیہ" کے مطالعہ سے اسے ذہن میں تازہ کرکے اُس کی بنیادوں کو نگاہوں میں لے آئیں اور اُن پر حضرت قاسم العلوم ہی کے ذوق کی نئی تعمیر تیار کردیں۔ اس لئے مولانا مرحوم کی یہ تمہیدی سطریں محض غم ہلکا کرنے ہی کے لئے تحریر کی قید میں **نہیں** لائی جارہی ہیں بلکہ وہ مستقبل کی روشنی کے لئے مینارہ بھی بن سکتی ہیں۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

ذیل میں یہ تمہیدی مضمون ملاحظہ کریں۔

محمد طیب غفرلہ
مدیر
دارالعلوم دیوبند
۴/۳/۷۶ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مآثرِ قاسمی

"سوانح قاسمی" کی تدوین وترتیب کی تاریخی سرگزشت کی داستان اس کتاب کی جلد اوّل کے مقدمہ میں مولانا قاری محمد طیب الحفید صدر مہتمم دارالعلوم کے خامہ، فیض شمامہ، کی نوک زبان سے سنائی جاچکی ہے۔ اسی مقدمہ میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر نوراللہ مرقدہ کی وفات حسرت آیات کے بعد ایک ہی دفعہ نہیں بلکہ مختلف زمانہ میں اس کتاب کے لکھنے اور لکھوانے کا ارادہ کیا گیا، لیکن عجیب وغریب عوائق واتفاقات پیش آتے رہے، زیادہ تر تو یہی ہوا کہ ارادہ ارادہ ہی بن کر ختم ہوگیا، البتہ چند توفیق یافتہ بزرگوں کو اس ارادے کی تکمیل کا موقعہ ملا۔ جن میں ایک تو ہمارے مصنف امام مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر اول دارالعلوم کا "کتابچہ" ہے خاکسار نے اپنی کتاب کا گویا "متن متین" اسی کتابچہ کو قرار دیتے ہوئے بطور ضمیمہ کے اپنی کتاب کے ساتھ تبرکاً وتیمناً ہی نہیں بلکہ اس لئے بھی شائع کرنے کا مشورہ دیا کہ شرح کے ساتھ گویا متن بھی پڑھنے والوں کے سامنے رہے بلکہ تاریخی نقطۂ نظر سے ان مختصر نوٹوں کی قدر وقیمت کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو جانتے ہیں کہ بچپن سے زندگی کے آخری ایام تک سیدنا الامام الکبیر کی رفاقت ہی میں گذرا۔ یہ سچ ہے کہ سوانح عمریوں کے سلسلہ میں بیاگرو فی (یعنی اپنی خود نوشتہ سوانح عمری، سب سے زیادہ قابل اعتماد سمجھی جاتی ہے لیکن تقویٰ ودیانت کی ذمہ داریوں کا سوال ان خود نوشتہ سوانحمریوں کے متعلق بھی بہرحال باقی رہتا ہے، ہم جب مولانا محمد یعقوبؒ کے کردار وسیرت اور جس قسم کے حزم واحتیاط کی ذمہ داریوں کا احساس اس نوعیت کے سیرت وکردار سے طبعاً

پیدا ہوسکتا ہے۔ ہم ان خصوصیتوں کو جب سوچتے ہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ دوسرے امتیازات کے ساتھ ساتھ یہ بھی سیدنا الامام الکبیر کی خصوصی شان ہے کہ جس خاص ذریعہ سے آپ کی سوانح کی متعلقہ معلومات ہم تک پہنچی ہیں۔ استناد و وثاقت میں عام بیاگرفیاں بھی مشکل سے ان کی ہم رتبہ قرار پاسکتی ہیں۔ اس باب میں ہمارے مصنف امام کا بیان خواہ جتنا بھی مجمل یا بعض مواقع پر غیر مرتب نظر آتا ہو۔ لیکن یقین و اطمینان کی جو خنکی عقلاً ان سے پیدا ہوتی یا ہوسکتی ہے۔ اسی خصوصیت نے ان کے متن مبین کو مستحق بنا دیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، چشم دید مشاہدات کے اس مجموعہ کو

"بندہ نے جناب مولٰنا مرحوم (سیدنا الامام الکبیر) کی سوانح عمری لکھی ہے، اور جو عجائب واقعات گذرے ہیں، اور جو جو کار نمایاں مولٰنا مرحوم نے کئے ہیں اُن کا مفصل حال بیان کیا ہے۔"

یہ اطلاع دیتے ہیں کہ اپنی اسی مرتبہ سوانح عمری میں

"بہت سے متفرق واقعات علمی و عملی جن سے جناب مولانا کا یکتائے روزگار ہونا علوم ظاہری و باطنی میں ظاہر ہوتا ہے، مشرح مرقوم کئے ہیں" ص۹ انتصار الاسلام

صرف یہی نہیں بلکہ آگے وہی یہ بھی ارقام فرماتے ہیں کہ اسی کتاب میں

"یہ بھی بیان کیا ہے کہ جناب مولانا مذکور کیا کیا چیزیں اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔"

گویا سمجھنا چاہئے کہ اس کھوئی ہوئی سوختہ و برشتہ "کتاب" کی اور کچھ نہیں تو ایک اجمالی فہرست ہمارے سامنے آجاتی ہے، کوئی شبہ نہیں کہ مولانا فخرالحسن مرحوم کی مرتب کی ہوئی یہ سوانح عمری اگرچہ جل کر نابید ہو چکی ہے۔ لیکن ان کی اس کتاب کی نوعیت اور قدر و قیمت کا سرسری اندازہ ان کے اس تحریری بیان سے ہوتا ہے، بلکہ چاہا جائے تو ان کی مرتبہ سوانح عمری کے مشتملات و مضامین کی اجمالی فہرست ان کے اسی بیان کو ہم قرار دے سکتے ہیں، پھر اسی کے ساتھ

جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ ساری معلومات جن کے اندراج کی اطلاع اس کتاب کے متعلق دی گئی ہے، یہ "حلقۂ قاسمی" کے ایک ایسے رکن رکین کی فراہم کردہ معلومات ہیں، جو علاوہ زمانی معیت اور مکانی قرب کے سیدنا الامام الکبیر کے ممتاز ترین تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کو براہ راست خود حضرت والا سے ان مضامین عالیہ کے سمجھنے کا موقعہ ملا تھا جن پر اس حکمت قاسمی کی بنیاد قائم ہے، گو اپنا تعارف کراتے ہوئے اسی موقعہ پر مولانا فخر الحسن صاحبؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"بندہ کا بھی ایک ادنیٰ شاگردوں میں شمار ہوتا ہے، اگرچہ سب میں ادنیٰ ہے لیکن اس انتساب کو اپنا فخر جانتا ہے۔"

لیکن سوانح نگاری کی اس مہم میں غیر معمولی کامیابی جو ان کو میسر آئی تھی، اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے باایں ہمہ انکسار و ہضم نفس جوش مسرت میں بے ساختہ یہ الفاظ ان کے قلم سے چھلک پڑے ہیں، ارقام فرماتے ہیں کہ

"یہ سوانح عمری لائق دید ہے، شاید ایسی عجیب چیز بھی اس زمانہ میں اور کوئی ہو۔"

گویا یہی ہوا کہ جیسے صاحب سوانح کی شخصیت اپنے عہد کی ایک عجیب وغریب بے مثال ہستی تھی، اسی طرح ان کی سوانح عمری بھی مرتب کتاب کے نزدیک اپنے زمانہ کے عجائب و نوادر ہی میں شمار ہونے کی مستحق تھی۔

سچ پوچھئے تو جب سے مولنا فخر الحسن مرحوم کے مندرجہ بالا الفاظ میری نظر سے گذرے ہیں، ان کی کتاب اور ان کی غیر معمولی محنت و مشقت کی بربادی پر زیادہ اور بہت زیادہ افسوس ہو رہا ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ اپنی اس کتاب میں انھوں نے کیا کچھ لکھا ہوگا، ان ہی کے بیان سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ہمارے مصنف امام کی مرتبہ سوانح عمری ضخامت کے لحاظ سے جیسے ایک "کتابچہ" ہے، اس کے برعکس

مولانا فخر الحسنؒ کی لکھی ہوئی سوانح عمری مستقل کتاب کا قالب اختیار کرچکی تھی، ان کے الفاظ ہیں کہ

"یہ سوانح عمری چونکہ ایک کتاب ہوگئی ہے"

اور گو ضخامت تو نہیں بتائی گئی ہے لیکن آگے انھوں نے جو یہ لکھا ہے کہ

"اسلئے بالفعل شائع ہونا اس کا ذرا دشوار ہے"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صفحات اس کتاب کے کافی ہوں گے۔ مگر اب اس پر بحث ہی فضول ہے۔ البتہ مولانا فخر الحسن مرحوم کے مذکورہ بالا بیان سے ان کی کتاب کے مضامین کی جو اجمالی فہرست ہمارے سامنے آگئی، آئندہ سیدنا الامام الکبیر کے سوانح نگاروں کے لئے روشنی کے مینار کا کام دے سکتی ہے۔ خصوصاً ان کے بیان کا یہ آخری جز یعنی

"جناب مولانا مذکور کیا کیا چیزیں اپنی یادگار چھوڑ گئے"

مولانا فخر الحسن نور اللہ مرقدہ کی فہرست مضامین کے اسی جز کی تعبیر خاکسار نے

"مآثر قاسمی"

سے کی ہے، اور اسی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ "سوانح قاسمی" کی مطبوعہ اور شائع شدہ دو جلدوں کے بعد بھی کام تشنۂ تکمیل ہے، یہ پچھلوں کی اپج، یا غیر ضروری مطالبہ نہیں ہے۔ بلکہ اس راہ کے اگلے پیش رو بزرگوں کی ایک ایسی موروثی تجویز ہے جس پر کسی نہ کسی حد تک کام کیا جا چکا تھا، اور ان ہی بزرگوں نے "سوانح قاسمی" کا ایک ناگزیر ضروری باب اس عنوان اور اس کی تفصیلات کو بھی قرار دیا تھا، چونکہ کتاب ناپید ہو چکی ہے، اس لئے صحیح طور پر نہیں بتا سکتا کہ اس عنوان کے نیچے سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کی کون کون سی چھوڑی ہوئی چیزوں کی تفصیل کی گئی تھی۔

لیکن معمولی غیر اہم جزئیات سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر سوچا جائے تو کلی حیثیت

سے عقلاً اس عنوان کے تحت چاہیئے تو یہی کہ حسب ذیل امور کا تذکرہ کیا جائے ۔

(۱) آپ کی جسمانی یادگاریں، آل و اولاد، بنین و بنات، حفدہ و ذریات ۔

(۲) آپ کے تعلیمی ثمرات جو تلامذہ کی شکل میں آپ کے بعد دینی علوم کے درس و تدریس، تالیف و تصنیف، اشاعت و نشر میں مشغول رہے ۔

(۳) آپ کی باطنی تربیت کے فیض یافتہ نفوس عالیہ جنھیں تصوف و سلوک کی اصطلاح میں ہم خلفاء و مریدوں کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں ۔

(۴) ملک کے اطراف و اقطار میں آپ کی بلا واسطہ یا بالواسطہ قائم کی ہوئی درسگاہیں جن میں گل سرسبد اور شاہکار ہونے کی حیثیت دار العلوم دیوبند کو حاصل ہے، ان تمام درس گاہوں کا پتہ چلانا، ان کی خدمات اور آخر میں دار العلوم کی ارتقائی تاریخ، عہد بعہد کے انقلابات اور تبدیلیاں جن سے گذر کر موجودہ دور تک دار العلوم اپنے تمام ذیلی شعبوں کے ساتھ پہنچا، ان امور کی تفصیل ہو۔

(۵) آخر میں سیدنا الامام الکبیر کے تصنیفی مآثر، اور تالیفی باقیات صالحات، ان کتابوں کے مشتملات و مضامین کی اہم خصوصیتوں کی طرف اشارے، ان سے استفادہ کی ممکنہ صورتوں کو امثال و نظائر کی روشنی میں سمجھایا جائے ۔

واقعہ یہ ہے کہ "سوانح قاسمی" کی مطبوعہ دو جلدوں میں جو ہزار صفحات سے تلاش کرنے والے "مآثر قاسمی" کی مندرجہ بالا تحلیلی فہرست کی متعلقہ معلومات کو اگر تلاش کرنا چاہیں گے تو چند اجمالی امور کے سوا مشکل ہی سے ان کی تفصیلات کے پانے میں ہم کامیاب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً پہلی بات ہی کو لیجئے۔ اسی کتاب کی جلد اول کے صفحہ ۵ پر فٹ نوٹ میں مولانا طیب صاحب خانوادہ قاسمی کی جسمانی یادگار اور ذریات کی اپنی معلومات کی حد تک تفصیل بھی کی ہے اور صاحب البیت ادری بما فیہ (اپنے گھرانے کے حال سے گھر والا ہی سب سے زیادہ واقف ہوتا ہے) کے قاعدے کی رو سے وہی اس تفصیل

کے مستحق بھی تھے۔ لیکن با ایں ہمہ اپنے اسی فٹ نوٹ کے مختلف موقعوں پر اس قسم کے الفاظ اور فقروں کو درج فرماتے ہوئے کہ

"فلاں کی اولاد کا علم نہیں ہے"

یا یہ کہ

"مجھے تعداد اور اسماء کا علم نہیں ہے"

آگے اس کی خبر دیتے ہوئے کہ

"ان میں بہت سے تو پاکستان میں ہیں۔ اور گو بہت سے ہندوستان میں ہیں مگر ان میں بعض نے دکن میں سکونت اختیار کر لی ہے، اور بعض بمبئی اور دوسرے مقامات میں ہیں"

گویا اپنی تفصیل کو بھی مولانا نے تشنۂ تکمیل بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ اسی طرح "مآثر قاسمی" کے دوسرے چارگانہ ارکان کے متعلق بھی اس میں شک نہیں جستہ جستہ اپنے اپنے موقعوں پر بقدر ضرورت کچھ نہ کچھ معلومات ضرور درج ہو گئی ہیں۔

جہاں ضرورت پیش آئی ہے، وہاں سیدنا الامام الکبیر کے ممتاز تلامذہ کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، کہیں کہیں آپ کے خلفاء اور طریقت کی راہ سے تربیت یافتوں کا بھی ذکر ہے، عام مدارس جو آپ کی توجہ سے قائم اور جاری ہوئے خصوصاً دارالعلوم دیوبند کے متعلقہ معلومات کے پیش کرنے کی حاجت جہاں محسوس ہوئی ہے پیش کرنے کی حد تک ان معلومات کو سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ یوں ہی سیدنا الامام الکبیر کی بعض خصوصی تصنیفات اور ان کے مندرجات و حالات سے بھی بحث کی گئی ہے۔ لیکن با ایں ہمہ مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیئے، کہ ان امور کے متعلق ان سارے ذکر و اذکار کی نوعیت ضمنی اور ذیلی مباحث ہی کی ہے۔ مقصود بالذات بنا کر "مآثر قاسمی" کے تحلیلی اجزاء اپنی تفصیل و توضیح کے اب بھی محتاج ہیں اور گو بظاہر دیکھنے والوں کو ابھی ان کی اہمیت

محسوس نہ ہو، لیکن ان اجزاء پر کام کرنے کے لئے لوگ جب کھڑے ہوں گے، تب راہ کی دشواریوں کا بھی ان کو صحیح اندازہ ہوگا۔ اور تلاش و جستجو ہر باب کے متعلق عجیب و غریب انکشافات سے پردہ اٹھاتی چلی جائے گی۔

سیدنا الامام الکبیر کے حلقہ میں بیٹھنے والوں کا ہی صرف دور ختم نہیں ہو چکا ہے۔ بلکہ اب تو حضرت والا کے دیکھنے والوں کو بھی ہم شاید نہیں پا سکتے۔ ان راہوں میں فراہمی معلومات کی صورتیں اب بھی رہ گئی ہیں کہ بچے کھچے تحریری وثائق مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شکل میں جہاں تک مل سکتے ہوں ان میں ڈھونڈھا جائے۔ یا ممکنہ حد تک قابل اعتماد راویوں کی بالواسطہ روایتوں پر بھروسہ کرکے ان گوشوں کو بھرا جائے، جن میں خلا پایا جاتا ہے۔ ان معلومات کی حالت یہ ہے کہ جہاں سان و گمان بھی نہیں ہوتا، وہیں سے اس سلسلہ میں بعض قیمتی چیزیں برآمد ہو جاتی ہیں۔ مثالاً یاد دلانا چاہتا ہوں، پہلی جلد کے شروع ہی میں خاکسار نے بہار کے ایک بزرگ مولانا حافظ تجمل حسین صاحب مرحوم کی کتاب "کمالات رحمانیہ" کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا شاہ فضلِ رحمٰن گنج مرادآبادی طاب ثراہ کا یہ قول نقل کیا تھا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو جوانی ہی میں ولایت مل گئی تھی۔ حافظ تجمل حسین مرحوم کو ذاتی طور پر خاکسار بھی جانتا ہے۔ بڑے بڑوں کو پایا کہ حافظ صاحب کا ذکر احترام کے ساتھ کرتے ہیں، جن میں حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات بھی تھی، مولانا مونگیری سے ان کی ملاقات بارہا دیکھا کہ ایک قریب ترین عزیز اور دوست کے طور پر ہو رہی ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات طیبات میں بھی حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ملتا ہے، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم تو ان کے ہم وطن اور اخص ترین عزیزوں میں تھے۔ مجموعی طور پر وہ مستحق تھے کہ ان کی روایت پر بھروسہ کیا جائے۔ اسی لئے ان کے اس دعوے میں کہ سیدنا الامام الکبیر مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر

بیعت کی سعادت ان کو حاصل ہوئی تھی۔ شک کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔[۵۱]

لیکن اسی کے مقابلہ میں "مشائخ بنارس" نامی کتاب جو حال میں شائع ہوئی ہے اسی میں بنارس کے ایک مولوی جو اپنے زمانہ میں کافی شہرت کے مالک تھے۔ جس کی بڑی وجہ تو یہی تھی کہ براہ راست حلقہ بگوش اسلام ہو کر اسلامی علوم کی تعلیم انھوں نے عربی زبان میں حاصل کی تھی، کہتے ہیں کہ جیدّ استعداد رکھنے والے مولویوں میں ان کا شمار تھا۔ لیکن مشرباً اس زمانہ کے حدیث العہد طبقۂ علماء میں چونکہ صرف شریک ہی نہیں ہو گئے تھے، بلکہ مولویوں کی اس نئی جماعت کے سرگرم ممبروں میں تھے۔ اس لئے یہ بات کہ دیوبند یا علماء دیوبند سے بھی کوئی نسبت رکھتے ہونگے دل پر اس کا خطرہ بھی کبھی نہیں گذرا تھا مگر مشائخ بنارس کے مصنف مولنا ابوالاثر عبدالسلام ان ہی مولوی سعید کو " مولنا سعید بن سردار کھڑک سنگھ پنجابی" کے الفاظ سے روشناسی کراتے ہوئے یہ اطلاع دیتے ہیں کہ

> "بعد قبول اسلام دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولنا محمد قاسم نانوتوی رح سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، اور تمام علوم وہیں حاصل کئے" ص۱۱ مشائخ بنارس

میرے لئے اس اطلاع کی نوعیت ایک جدید انکشاف کی ہے۔ مولنا سعید کھڑک سنگھ پنجابی کے صاحبزادے تھے۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہو سکتی، میرے لئے یہ نئی خبر نہ تھی۔ نیز عرض ہی کر چکا ہوں کہ مذہب کی گرفت کو ڈھیلی کرنے کے لئے حکومت مسلطہ نے تعلیم کے جس نظام کو جاری کیا تھا۔ امید یہ تھی کہ ہندوستان کے

---

[۵۱] حضرت نانوتوی رح کے ساتھ غیر معمولی گرویدگی و عقیدت مندی کا شاید یہ اثر تھا کہ اپنے صاحبزادے کا نام انھوں نے محمد قاسم رکھا۔ دارالعلوم دیوبند میں بھی ان کو داخل کیا۔ پٹنہ کے مدرسہ شمس الہدیٰ میں درس کی خدمت انجام دیتے ہوئے وظیفہ یاب ہو کر (موضع دسینہ) میں خانہ نشین ہوئے ۱۲

عام باشندے اس تدبیر سے عیسائی مذہب کو قبول کر لینگے جسے نئی تعلیم سے پیدا ہونے والی ذہنیتوں سے قریب تر بنا لینے کی کوشش صدیوں سے جاری تھی، اور یہ نہ بھی لیکن اپنے آبائی دین دھرم کو چھوڑ بیٹھیں گے۔ یوں حکمراں طبقہ سے مذہبی نفرت و تعصب ان میں باقی نہ رہے گا، لیکن نتیجہ جب سامنے آنے لگا تو بجائے عیسائیت کے اسلام کی طرف لوگوں کا رحجان بڑھنے لگا۔ پس کھڑک سنگھ کے صاحبزادے کا اسلام قبول کر لینا اس زمانہ کے لحاظ سے کوئی اہم بات نہ تھی، کافی طویل فہرست اس عہد کے نومسلم باشندوں کی پیش کر چکا ہوں۔

اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں، اگر یہ مانا جائے کہ قبول اسلام کے بعد دارالعلوم دیوبند میں مولوی سعید صاحب نے دینی علوم کی تعلیم حاصل کی ہو۔ پچھلے دنوں کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے والے ملک کے مشہور عالم مولنٰنا عبیداللہ سندھی بھی ان ہی خوش قسمتوں میں تھے۔ یعنی اسلام قبول کر کے دارالعلوم دیوبند میں اپنی دینی تعلیم کی مولنٰنا نے تکمیل کی تھی، اسی طرح دیوبند میں تعلیم پانے کے بعد مسلک عدم تقلید کو اختیار کرنے والوں کی تاریخی مثال مولنٰنا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری مرحوم کی ہمارے سامنے ہے۔ ہم اسی راہ کے ایک راہ رو مولوی سعید صاحب بنارسی کو بھی قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن مولوی عبدالسلام صاحب کی روایت کا یہ جز کہ مولوی سعید صاحب نے

"مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ سے حدیث کی کتابیں پڑھیں"

اور اس کے بعد بھی وہ غیر مقلد ہو گئے، نہ صرف میرے لئے بلکہ سیدنا الامام الکبیر کی درسی خصوصیات سے جو بھی واقف ہیں، ان کے لئے یہ روایت مستحق تحقیق و تنقید بن جاتی ہے۔ قرین عقل و قیاس یہی ہے کہ دارالعلوم کی تعلیم کو مولنٰنا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرنے والوں نے منسوب کر دیا ہے، اور نہ جاننے کی وجہ سے

مولانا ابو الاثر عبد السلام صاحب اس غلط فہمی کے شکار ہوئے، ورنہ اگر وہ یہ جانتے کہ سب کچھ ہونے کے باوجود درساً وتعلیماً و نظماً واہتماماً سیدنا الامام الکبیر دار العلوم سے کچھ نہ ہونے کا رشتہ رکھتے تھے۔ اسی لئے بجز خاص لوگوں کے دار العلوم میں داخل ہونے والے عام طلبہ کو نہیں پڑھاتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مآثر قاسمی کو گو خاکسار نے پانچ مدوں میں تقسیم کر کے پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہر مد کا صحیح حق اسی وقت ادا ہو سکتا ہے کہ ہر ایک مد کے متعلق الگ الگ مستقل جلد لکھی جائے۔ پہلی مد یعنی حضرت والا کے آل واولاد میں جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں ایسی شخصیتیں بھی شریک ہیں جو مستحق ہیں کہ انکی مستقل سوانح عمری لکھی جائے۔ براہ راست صاحبزادے حضرت مفتی حافظ محمد احمد صاحبؒ خود بھی اور ان کے بڑے نجل رشید مولانا محمد طیب صاحب کے سوا مولانا طیب صاحب کے مرحوم چھوٹے بھائی مولانا محمد طاہر باوجودیکہ عمر کا کم حصہ ان کو عطا ہوا۔ لیکن ان کی زندگی کے مختلف علمی وسیاسی کارناموں کا اقتضاء ہے کہ ان کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے۔ اسی طرح دودمان قاسمی کے ایک روشن چراغ مولانا منصور انصاری الغازی المجاہد الہندی منشاءً والکابلی ہجرۃً بھی اسی سلسلہ کی ایک خاص تاریخی شخصیت تھے، خود وہ بھی اور انکے فرزند سعید مولانا حامد الانصاری غازی کی قلمی خدمات بھی حق رکھتی ہیں کہ شجرہ طیبہ قاسمیہ میں ان کو نمایاں کیا جائے، اور ان بزرگوں کے علاوہ ڈھونڈھنے والوں کے سامنے دوسری ہستیاں بھی آسکتی ہیں۔

یوں ہی سیدنا الامام الکبیر کے تلامذہ اور شاگردوں کی تعداد خواہ جتنی بھی کم ہو لیکن نہ صرف ایک شیخ الہندؒ بلکہ ان کے دوسرے رفقاء درس مولانا احمد حسن امروہوی مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمہم اللہ جیسے اس کا بجا حق رکھتے ہیں کہ مستقل جلد میں ان بزرگوں اور ان سے نفع اندوزوں کا ذکر کیا جائے۔

تلامذہ کے سوا جن لوگوں کو باطنی تربیت کا موقعہ حضرت والا کو میسر آیا۔ تلاش کرنے والے ان کا بھی سراغ لگا سکتے ہیں، جستجو و تلاش سے معلوم ہوگا کہ اس نوعیت کے مستفیدوں کے تفصیلی حالات کے لئے مستقل جلد کی ضرورت ہے۔ گویا یوں تین جلدیں تو یہی ہو جاتی ہیں۔

باقی خود دارالعلوم دیوبند اور اس کے سوا ملک کے طول و عرض میں سیدنا الامام الکبیر کی تحریک و توجہ کی بدولت جو دوسری اسلامی درسگاہیں قائم ہوئیں۔ جن کی اچھی خاصی تعداد اب بھی موجود ہے۔ ان کی تفصیلی تاریخ کے لئے ایک جلد کافی ہو جائے تو اس کو غنیمت شمار کرنا چاہیئے۔ ورنہ ممکن ہے، کہ اس مضمون کو دو جلدوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت ان لوگوں کو محسوس ہو، جو اس کام کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیں گے۔ یعنی ایک جلد براہ راست دارالعلوم کی صد سالہ تاریخ پر اور دوسری جلد دارالعلوم کے سوا دوسری درس گاہوں کے لئے مختص کردی جائے، تو حالات سے جو واقف ہیں۔ وہ اس تخمینے کو بے بنیاد ٹھیرانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

اور گو تصنیفی و تالیفی مآثر کا دائرہ حد سے زیادہ تنگ ہے تاہم جن اچھوتے اور نت نئے خیالات پر یہ کتابیں مشتمل ہیں۔ کم از کم ایک جلد تو اس کے لئے بھی مختص ہی کرنی پڑے گی۔

کام کی طوالت کی اسی کیفیت کو دیکھ کر فقیر نے ارادہ کرلیا تھا کہ اپنے کام کو صرف ان ہی دو جلدوں تک محدود کر دے۔ جن کا اکثر حصہ بحمد اللہ شائع ہو چکا ہے، لیکن ہمارے مخدوم و محترم مولانا محمد طیب صاحب نے دوسری جلد کو خاص بات پر ختم کرکے فقیر کے نوشتہ مسودہ کے آخری حصہ کو اس لئے روک لیا ہے کہ کچھ اضافہ کرکے تیسری جلد اس سے تیار کرلی جائے۔ اسی عرصہ میں فقیر طویل علالت کا شکار ہوا، اور ایسا شکار کہ اس وقت تک اسی پھندے میں تڑپ اور پھڑک رہا ہے، مدتوں

چند سطروں کا لکھنا بھی میرے لئے دشوار ہے۔ کبھی کبھی خفت کی کیفیت محسوس ہوتی ہے مولانا کا حکم ہے کہ خفت کے ان ہی وقفوں میں کم از کم اس تیسری ناقص جگہ کی تکمیل کی کوشش جاری رکھو۔ جس خاندان کی رہین منت میری نہ صرف دینی بلکہ دنیاوی زندگی بھی ہے، "الاولیٰ" میں جو کچھ مل چکا ہے اور "الآخرہ" میں بھی دودمان عالی سے فیض یافتوں کی نظر کرم کا امیدوار ہوں، ان سب کا تقاضا ہے کہ "امرطیب" کے امتثال و تعمیل کی سعادت جس طرح بھی بن پڑے حاصل کی جائے۔ لیکن "رہ رہ کر دل کے جو دورے پڑ جاتے ہیں" خود تو گذر جاتے ہیں، لیکن جس پر سے گذر جاتے ہیں مدتوں کسی کام کا وہ باقی نہیں رہتا"۔ حیص و بیص کے ان ہی حالات میں تہ و بالا ہوتا رہتا ہوں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ "مآثر قاسمی" کا یہ دو لفظی عنوان بظاہر جتنا بھی کمتر و مختصر نظر آتا ہے۔ لیکن تحلیل و تجزیہ کے بعد ہی تحقیق و تلاش تدوین و ترتیب کی بھی وادی طول و عرض و عمق میں پھیل کر کتنی وسیع ہو جاتی ہے، اسی قدر وسیع کہ پانچ جلدیں بھی بہ مشکل اس کے لئے کافی ہو سکتی ہیں۔ مجھ جیسا بیمار، رفتہ از کار تو شاید اس کی پہنائیوں کو اب سوچ بھی نہیں سکتا۔ بس دعا ہی کر سکتا ہے کہ توفیق یافتہ افراد کو ہمت عطا فرمائی جائے۔ حق سبحانہ و تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ ان مہمات کی سرانجامی کے لئے کن بیدار بختوں کا ازل میں انتخاب ہوا ہے۔ وہی تقدیر و تدبیر کی دنیا میں کن انتخابی ہستیوں سے سر نکالتی ہے ؎

دادیم ترا ز گنج مقصود نشاں

ما نرسیدیم، تو شاید برسی

اور یہ کہ اپنا خیال تو یہی ہے کہ بجائے کسی ایک آدمی کے مناسب ہوگا کہ اس سلسلہ کی ایک ایک جلد فرزندانِ دارالعلوم میں سے ایک ایک صاحب کے سپرد کر دی جائے۔ خاکسار نے اپنی حد تک یہ سوچا ہے کہ "مآثر قاسمی" کی آخری مدنیتی آپ

کی تصنیفات و تالیفات کے تذکرہ و تبصرے کی حد تک سعی کا ارادہ کرے - دو جلدوں
کے اتمام کا کام جس نے پورا کرایا کیا بعید ہے کہ وہی علی کل شئی قدیر اپنے اس
زار و نزار فقیر و بیمار بندے سے اس کام کو بھی پورا کرا دے -

وما ذلک علی اللہ بعزیز